سلسلہ تصنیفات مسلم بک سوسائٹی نمبر ۶

لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت

رازِ حیات

جس کا دوسرا نام

انجیل عمل

ہے

مُصنفۂ

خواجہ کمال الدین صاحب مُبلّغ اِسلام و امام مسجد ووکنگ (انگلستان)

جولائی سنہ ۱۹۲۱ء

میں

مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل لاہور نے شائع کی

مطبوعہ کریمی پریس لاہور

باہتمام میر امیر بخش منیجر مطبع چھپا

تعداد دو ہزار

بار اول

بلادِ غربیہ میں اسلام کا مشعل بردار

اسلامک ریویو مجریہ انگلستان قیمت سالانہ ۸عہ

(قیمت سالانہ ۸عہ)

اس کا اُردو ترجمہ

اشاعت اسلام

(قیمت سالانہ ...)

ایڈیٹر حضرت خواجہ کمال الدین صاحب بی اے ایل ایل بی مسلم مشنری

مسلم پبلک میں اسلامک ریویو کسی معرفت کرانے کا محتاج نہیں ہم صرف برادرانِ اسلام کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ اس وقت اسی کے منافع پر انگلستان میں اسلامی مشن کے اخراجات بہت حد تک چل رہے ہیں اس کا ہر ایک خریدار اب گویا بلاد غربیہ میں اسلام کا خود متکفل ہو جاتا ہے اگر برادرانِ ملت کوشش کرکے انگریزی رسالہ کے پانچہزار اور اُردو کے دس ہزار خریدار پیدا کردیں تو ان کا منافع ہمارے دوکنگ اسلامی مشن کا کفیل ہو سکتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ انگریزی رسالہ کئی ہزار تک بلاد غربیہ میں مفت تقسیم ہو۔ اگر کوئی تبلیغ اسلام کا شیدائی ہمیں پانچ روپے سالانہ کے بھیجدے تو ہم انکی جگہ ایک انگریزی رسالہ یورپ میں مفت تقسیم کردینگے - کیا ملت بیضا کی اشاعت کے عاشق چند ہزار بھی ہندوستان میں نہیں؟

سپوتو اُٹھو! جاگو! [illegible] کو غنیمت سمجھو!!! اسلامک ریویو ہی ایک کامیاب ذریعہ اشاعت اسلام کا ثابت ہوا ہے اور بفضلہ تعالے اس نے اپنی عزت کو یورپ میں نہایت آب و تاب سے قائم کیا ہے اس کو مضبوط کرنے کی کوشش کرو - اور اللہ تعالے سے اجر جزیل پاؤ گے والسلام

المشتہر - خواجہ عبد الغنی منیجر رسالہ اسلامک ریویو و اشاعت اسلام عزیز منزل لاہور

فہرست مضامین ازحیات

اِنتساب

اعصابِ دماغ کی تکلیف نے گذشتہ دو سال سے مجھے قلم اُٹھانے سے روک رکھا تھا۔ اور تصنیف کی قوت عمل حالت جمُود میں آچکی تھی۔ لیکن عالیجناب حضرت قبلہ شیخصاحب جہانگیر میاں صاحب سلمہٗ والیٔ منگرول کی ایک تجویز و تحریک نے میری اِس حالت میں ایک عملی صُورت پیدا کر دی جِس سے میں نے سلسلۂ تصنیف کو شرُوع کر دیا۔ اِس کتاب میں مَیں نے قوتِ عمل پر زور دیا ہے لہٰذا اگر آپ کے نام نامی سے اِن اوراق کو مَیں عزّتِ نسبت دُوں تو بالکُل صحیح اور درست ہو گا +

خواجہ کمال الدین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

وجہ تصنیف از حیات

(انجیل عمل)

اعلموا ان اللہ یحیی الارض بعد موتھا

آج قوم پر ایک مُردنی سی چھا گئی ہے۔ نجیروں نے ہماری ہستی کے دن گن دیئے ہیں۔ طاقت شوکت۔ عزت تمکنت سب اسوقت انحطاط پر ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ ہم جاگ پڑے ہیں لیکن اس وقت ہماری حالت اُس انسان کی سی ہے جو گہری نیند سو رہا ہو۔ اور ابھی اندھیرا ہی ہو۔ اچانک اسکے سرہانے یا اسکے اِرد گرد کوئی شور برپا ہو جس سے وہ یکلخت بیدار ہو جائے۔ وہ گھبرایا ہوا اُٹھے اور جس مُہیب نظارہ کو تخیّل و تصوّر نے پیدا کیا تھا۔ اس سے بچنے کیلئے اندھیرے میں بھاگ اُٹھے کچھ عجب نہیں کہ وہ ایسے وقت میں کسی گڑھے میں جا پڑے یا کسی مُوذی جانور کا شکار ہو جائے۔ ہماری حالت ہو بہو یہی ہے موت مُنہ کھولے ہوئے سامنے کھڑی ہے۔ ہم گھبرائے ہوئے قیام ہستی کیلئے کچھ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ قدم ضرور اُٹھ چکا ہے لیکن یہ قدم اندھیرے میں ہے۔ ممکن ہے کہ ہم صراط مستقیم پر کھڑے ہو جائیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم کسی مُوذی جانور کا شکار ہو جائیں۔ دوسری طرف یہ بھی خطرہ ہے کہ پاؤں پھسلے اور ہم ہمیشہ کیلئے

تعرِ مذلت میں گر جائیں۔ ایسے ہی وقتوں میں گندم نما جو فروش دوست بنجاتے ہیں جنہیں اپنا اُلو سیدھا کرنا ہوتا ہے جو مصیبت زدہ کو اپنی اغراض کا آلہ بنا لیتے ہیں +

لیکن اس موتا موتی میں کیا ہمارے سامنے کوئی راہ حیات نہیں اس اندھیرے میں روشنی کیطرف لیجانیوالی کوئی چیز نہیں۔ کیا کسی کتاب نے اپنے متعلق یہ الفاظ نہیں کہے کتٰب انزلنٰہ الیک لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور باذن ربھم الی صراط العزیز الحمید یہ وہ کتاب ہے جو انسانوں کو اندھیرے سے نکالکر روشنی کیطرف لیجاتی ہے اسی کے ذریعہ رب العالمین کے حکم سے انسان اس فنا ہراہ پر چڑھ جاتا ہے جس سے وہ دنیا کی نگاہ میں محمود اور صاحبِ عزت ہو سکتا ہے۔ (۳) کتاب کی غرض نزول احیاء اموات تھی اس کے اُترنے کے وقت دنیا کے رہنے والے بقید حیات تو تھے لیکن خدا کی نگاہ میں مُردہ تھے۔ اس احیات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مُردہ زمین کو زندہ کرنا چاہا وہ کتاب آج بھی ہمارے گھروں میں موجود ہے لیکن جزدانوں میں بند۔ وہ طاق عزت پڑھی پڑی ہے وہ کھلتی ضرور ہے لیکن فال دیکھنے کیلئے۔ ہم اُسے سر پر بھی رکھتے ہیں لیکن حلف اُٹھانے کیلئے ...... یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا قرآن نے اُمت رسولؐ کے کسی آیندہ طبقے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ برنگ شکایت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لب ہائے مقدس پر جاری ہونے کی نقل کی ہے

"اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا"

اس سے بڑھ کر اور کیا ہماری بدقسمتی ہوگی۔ کہ تیرہ سو برس کے بعد ہم ہی ان الفاظ کے آج مصداق بنگئے۔ کاش ہم نہ ہوتے! ہمارا ہی وجود نامسعود آنحضرت صلعم کی زبان پر قیامت کے دن یہ الفاظ لائیگا +

لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اب بھی ہم اس ذلت اور غم کی زندگی سے نکل سکتے ہیں

لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین ۝

اگر قرآن آبحیات ہے تو تم اسے کیوں نہیں پیتے؟ اگر قرآن صراط مستقیم ہے تو تم کیوں دوسری راہ پر چلتے ہو۔ ہندو اگر حصول مقصد کیلئے کوئی مغربی راہ اختیار کریں تو وہ سچے ہیں نہ وید میں موجودہ مشکلات سے نکلنے کا راستہ ہے نہ اپنشد میں کوئی اس کا علاج ہے۔ منوں جی بھی کوئی نسخہ نہیں بتلاتے لیکن تم تو اس بات کے مدعی ہو کہ قرآن میں ہر چیز کا علاج موجود ہے۔ وہ خود بھی ایسا ہی کہتا ہے وما فرطنا فی الکتٰب من شئ پھر گھبراہٹ کیوں ہے؟ پھر یہ اُلٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مارنے کیا معنی رکھتے ہیں۔ صراط مستقیم یہی ہے۔ کہ قرآن پڑھو اور اس پر عمل کرو +

یہ چند اوراق جو میں نے کتاب کی شکل میں لکھوا دیئے ہیں یہ صرف مُنہ سے نکلی ہُوئی صوت نہیں۔ بلکہ دل جگر خون ہو گئے ہیں۔ یہ اُسی خون کے قطرے ہیں جو لفظوں کی شکل میں کاغذ پر آبیٹھے ہیں۔ کیا ظلم عظیم ہے۔ تمدن و ترقیٔ انسان پر یورپ کی جو تصنیف اُٹھاتا ہوں۔ ان سب میں میں اسی تعلیم کی اک خفیف سی جھلک دیکھتا ہوں جو اپنے کامل رنگوں میں کتاب حمید کی سطروں میں آ جلوہ افگن ہوتی ہے۔ بسا اوقات میں نے ایسی مغربی تصانیف آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ پڑھیں۔ دِل میں درد اُٹھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہی لفظ اکثر زبان پر آئے۔ کہ اے بار الٰہ اِن مغرب کی تصانیف میں جو راز ہائے

زندگی ظاہر کئے گئے ہیں۔ وہ تو اس رازِ حیات سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتے جو لوحِ قرآن میں محفوظ ہیں پھر حاملانِ قرآن کو کیا ہوا۔ اسکے جواب میں خود قرآن نے یہی جواب دیا کہ انہوں نے مجھے چھوڑا خدا نے انہیں چھوڑا +

آج ہمیں خلافت کا ماتم ہے۔ اور صحیح طور پر ہے۔ قرآن ہمیں ایک خلافت کا وعدہ دیتا ہے جس کے وجود کے ساتھ قرآن کا ایک اور وعدہ پورا ہونا ہے۔ اور آج تک ہوتا رہا یعنی ہمارے اماکن مقدسہ کا غیروں کی دستبرد سے محفوظ رہنا ہم اُن پاک مقاموں کو ایسے مسلم ہاتھوں میں دیکھنا چاہتے ہیں جو غیر مسلم رُعب و اثر کے نیچے نہ ہوں ہم سرزمین عرب کو غیروں کی ریشہ دوانی کے ماتحت قبائل عرب کے کُشت و خون سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم حجاز کی زمین میں حاجیوں کو اور صرف حاجیوں کو چلتا پھرتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیا ہماری یہ خواہشیں اور جذبات بیجا ہیں؟ کیا صلیبی جنگوں کی بنیاد اور دیگر یورپین پولیٹیکل تنازعات و مطالبات کی وجہ وہ چند اینٹیں اور لکڑی اور پتھر نہیں جنہوں نے چرچ آف رزرکشن کی شکل اختیار کی ہوتی ہے یعنی اس مقام پر بنا ہوا گرجا جہاں کہتے ہیں کہ صلیب کے واقعہ کے بعد مسیح قبر میں ڈالا گیا۔ اور وہاں سے نکلا۔ یہی عمارت سب مصائب کا موجب ہوئی۔ کیا انگریزی گورنمنٹ عیسائیوں کے احساسات کیلئے خونچکشی نہیں کرتی؟ کیا مشنریوں کی حفاظت کیلئے پولیٹیکل مصائبات اُٹھ کھڑی نہیں ہوتیں۔ پھر یہ عیسائی لوگ کونسا حصہ رعایا کا ہیں۔ برٹش تاج کے نیچے مسلمان ہی سب سے زیادہ ہیں ان ہی کی جیب سے زیادہ خراج جاتا ہے۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ جس قدر عیسائی احساسات کا لحاظ کرتی ہے

اس سے دس گنا زیادہ مسلم احساسات کا خیال رکھے۔
لیکن میں مسلمانوں سے بھی پوچھتا ہوں۔ کہ کیا خلافت کے جانے کے اصلی اسباب پر بھی انھوں نے کبھی غور کیا۔ وہ تو اس جنگ یورپ سے بہت پہلے ٹرکی میں مصر میں اور دیگر ممالک اسلامی میں کام کر رہے تھے اور وہ آج بھی موجود ہیں۔ جان تو پہلے ہی نکلنے کو تھی۔ جنگ یورپ موت کا ایک بہانہ ہو گیا۔ مکان تو پہلے ہی کھوکھلا تھا۔ جنگ نے بادصرصر کا کام دیا۔ ہم خلافت تو چاہتے ہیں لیکن جب ہم میں وہ بات ہی نہیں کہ جو طاقت وسطوت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ تو پھر یہ سب کھیل ہی کھیل نہیں تو اور کیا۔ وہ بات جس سے قومیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ اور زندہ رہتی ہیں وہ انسان میں بلا امداد خارجی خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں جن رازہائے حیات کا پتہ مجھے مطالعۂ قرآن سے ملا ہے وہ میں ان اوراق میں لکھ دیتا ہوں! اور وہ **قوت عمل** ہے جسے اسلام سے چار پانچ سو برس پہلے اس مذہب نے مٹایا جس کی بنیاد پالوس نے خلاف تعلیم جناب مسیح ان کے نام پر رکھی حضرت مسیح کو تو اس بادشاہت کی انجیل یعنی بشارت دی گئی تھی۔ جس کا چارٹر قرآن کریم تھا لیکن پالوس نے اُسے انجیل بے عملی ٹھیرایا اس نے دنیا کو اطلاع دی کہ زمانہ آج تک شریعت و عمل کے طوق میں تھا۔ جس سے مسیح نے آکر نجات دی ہے جو اس طوق عمل سے نجات چاہے اسکے لئے بشارت یہ ہے کہ وہ خون مسیح پر ایمان لائے۔ چنانچہ بقول لوتھر ایمان ہی نجات کیلئے کافی ہے عمل کی انسان کو ضرورت نہیں۔ اس تعلیم کا نتیجہ جو یورپ کی تمدن پر عیسائی ابتدائی صدیوں

اور ایام وسطیٰ میں جو ہوا وہ محتاج بیان نہیں۔ رومی یونانی تمدن تباہ کر دیا گیا۔ علم و عمل کے دروازے بند ہو گئے۔ غفلت۔ سستی۔ اپاہج پن۔ بیکاری۔ الغرض جو آج ہماری حالت ہے۔ وہ عیسائی یورپ کی ہو گئی۔ یعنے فقدان عمل نے کُل یورپ پر پورا تسلط کر لیا۔ اس سے ملتی جُلتی حالت ہندوستان کی بھی تھی۔ ایکطرف بدھ مذہب نے اور دوسری طرف ہندو مسئلہ مایا نے قوت عمل کو ہلاک کر دیا۔ اس مردگی کی حالت میں قرآن دُنیا میں انجیل عمل لایا۔ قرآن نے ایمان و عمل کو لازم ملزوم ٹھیرایا۔ ایمان کو اگر درخت بتایا۔ تو عمل صالح کو اسکے لئے پانی ٹھیرایا۔ جہاں الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کہا وہاں ساتھ ہی جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ سُنایا۔ اور اسطرح ہمیں سمجھا دیا۔ کہ اس جہان میں اور ایسا ہی آنیوالے جہان میں حیات جاودانی کا بھید قوت عملمیں سربستہ ہے تمہیں اگر راز حیات کی تلاش ہے تو یہ بشارت حیات انجیل عمل ہے

اِن اوراق کے پڑھنے والے انہیں ایک دردمند دل کی آواز سمجھیں جس کے قلب میں رنج۔ غم۔ تاسّف اور قہر درویش برجان درویش کے جذبات لہریں مار رہے ہیں۔ ایسے شخص کی فرو گذاشتیں قابل التفات نہیں ہوتیں قارئین کرام میرے مطالب کو سامنے رکھیں اور اس سے فائدہ اُٹھائیں اور عبارت کا چنداں لحاظ نہ کریں کہ میرا مافی الضمیر کس لباس میں انکے سامنے آیا میرے لئے دعاء خیر کریں کہ میں جلد صحتیاب ہو کر اپنے ہاتھ سے کچھ لکھوں۔ ابھی صحت اس قابل نہیں کہ خود قلم اُٹھاؤں۔ آجکل جو کچھ تصنیف و تالیف کرتا ہوں۔ وہ میں لکھتا نہیں بلکہ لکھاتا ہوں۔ یہ طریق لغزش سے خالی نہیں ہوتا۔ جسے قابل معافی سمجھنا چاہیئے

خواجہ کمال الدین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

رازِ حیات

یعنی

انجیلِ عمل

لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ

جو کماتے ہو خود کماتے ہو

جو گنواتے ہو خود گنواتے ہو

میرا نفع میرا نقصان میرے ہی اعمال کے نتائج ہیں۔ میں اپنی رنج و راحت خود ہی پیدا کرتا ہوں۔ میری ترقی میرا تنزل میرے ہی ہاتھ کے کھیل ہیں۔ میری عزت میری ذلت میرا اقبال میرا ادبار میری ثروت میری مسکنت میری شوکت میری نکبت سب کے سب میرے ہی افعال کے ثمرات ہیں۔ میں ہی اپنی کشتی کا ناخدا ہوں۔ اپنی عمارتِ زندگی کا میں خود ہی انجنیر ہوں۔ قوائے فطریہ میری ہی خدمت کے لئے پیدا ہوئے۔ مظاہرِ قدرت میرے ہی غلام ہیں۔ لیکن میری اپنی ہی استعداد

اور میری اپنی ہی تیاری ان سب کو میرے نافع یا میرے ضرر رساں یا میرے معاون یا مخالف بنا دیتی ہے۔ جس طرف میں قدم اٹھاتا ہوں۔ خواہ وہ بلندی کی طرف ہو یا پستی کی طرف یہ سب کی سب خدا کی بنائی ہوئی چیزیں میری اپنی ہی رفتار کے مطابق میرے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ میرے اِرد گرد میرے نیچے اُوپر کوئی بھی ایسی چیز نہیں جسمیں میرا فائدہ میری خیر میری برکت مضمر نہ ہو لیکن اِس خیر و برکت کا ظہور میرے ہاتھوں کو دیکھ رہا ہے۔ جن کی غلط حرکت ان خدّام و معاونین کو میری ہلاکت و تباہی کا باعث بنا دیتی ہے خدا کا پانی میرے ہی عمل و حرکت کے ماتحت ابرِ رحمت یا سحابِ زحمت ہو جاتا ہے۔ آگ میرے لئے ثلج جنت اور پانی میرے ہی اشارے پر میرے لئے نارِ دوزخ بن جاتا ہے۔ الغرض اِس دنیا میں اور آیندہ بھی میرے زندگی کے دونوں پہلو روشن یا تاریک میرے ہی افعال کے آثار و اظلال ہیں +

لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت دیکھنے کو تو ایک چھوٹا سا فقرہ ہے۔ اور قرآن شریف کی آیت کا ایک ٹکڑہ۔ لیکن یہی وہ انجیل مقدس اور بشارت عظمےٰ ہے کہ جس پر عمل کرنے سے فی زمانہ دنیا کے بنائے ہوئے سب خدا تختِ الوہیت سے اُتر کر انسان کے برابر یا اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ یہی عمل خود داری کی جان اور عزتِ نفس کا راز ہے۔ انسان نے صرف اپنے

نفع یا نقصان کی خاطر دوسروں کے آگے وقتاً فوقتاً سر جھکایا ہے
ایک وقت وہ عناصر و مظاہر قدرت کو اپنے نفع و نقصان کا
مالک سمجھتا رہا۔ جس سے شجر حجر۔ نجم۔ عناصر پرستی پیدا
ہوگئی بعض وقت اس نے اپنی رنج و راحت کو بعض غیر مرئی
قوتوں سے وابستہ سمجھا۔ جس سے بھوت پریت۔ جنّ۔ پری
کے وجود نے اس کے معتقدات میں اپنی جگہ قائم کی۔ پھر وہ انسانوں کو
اپنا قاضی الحاجات اور اپنے نفع و نقصان کا مالک سمجھنے لگا۔
جس نے اس کے جذبہ خودداری کو ہلاک کر کے اُسے دوسروں کا
غلام بنایا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی خدا داد قوتیں
حرکت میں نہ آئیں۔ اس کے مضمر قویٰ آہستہ آہستہ مر گئے
اسکی عقل تاریک ہوگئی۔ وہ اپنا راستہ خود نہ دیکھ سکا۔ اسکی
رسن دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اور وہ انسانیت چھوڑ کر
ایک چارپایہ بنگیا۔ جسے اسی کا ایک ہم نوع لیکن چالاک فرد جہاں
چاہا لیگیا۔ اور جس طرح چاہا اس سے خدمت لی +

اِس ذلت سے بچنے کے لئے قرآن کریم نے کیا اچھی مثال
دی تھی پر جسے بد قسمت مسلمان نے طوطے کی طرح رٹا۔ اسکو
زبان پر دُہرانا تو اپنے لئے موجب سعادت سمجھا۔ اور وہ واقعی
تھا لیکن نہ اُن لفظوں کی تلاوت بلکہ ان کے معانی کو اپنا
دستور العمل بنانا تھا جو اسے شرافت انسانیت عطا کرتا +

افمن یمشی مکبا علی وجهه اھدی امن یمشی سویا علی صراط مستقیم

ترجمہ - کیا وہ مخلوق جو سر نیچے کئے ہوئے ہے سیدھا راستہ دیکھنے میں زیادہ ہدایت پر ہے۔ یا وہ جس کا سر سیدھا ہے - خدا نے تمہیں آنکھ - کان اور دل دیا ہے لیکن تم میں بہت کم ہیں جو ان کی پوری قدر کرتے ہیں....

کیا سچی حقیقت ان پیارے لفظوں میں کھولدی گئی ہے یہ ربانی الفاظ صحیفۂ قدرت میں کے دو مخلوق کی طرف اشارہ کرتے ہیں - ایک وہ جس کی گردن اور سر زمین کی طرف ہے۔ یعنی چارپائے - اور ایک وہ جس کا سر بلند و بالا ہے یعنے **انسان** - قرآن کا پڑھنے والا - اس رمز کو سمجھے کہ قرآن کیا کہہ گیا - وہ اپنی گردن کو دیکھے - اسکی بناوٹ اور لچک پر غور کرے - اپنی آنکھ اور کان کے مقام کو دیکھے پھر ان چیزوں کو حیوانوں میں دیکھے - پھر خالق کی منشاء پر غور کرے حیوان ایک گز یا ڈیڑھ گز سے آگے نہیں دیکھ سکتا - لیکن انسان کی حدِ نگاہ کا تو اندازہ ہی کچھ نہیں - حیوان کی گردن اُسے دائیں بائیں دُور تک دیکھنے سے مانع ہے - لیکن انسانی گردن کی لچک تو اس کے راست وچپ اس کے نشیب و فراز اسکے آگے پیچھے کے حدود کا کوئی اندازہ ہی نہیں رہنے دیتی - اسکے حدود اس کی اپنی ہمت و حرکت پر حصر رکھتے ہیں - اِس ہی لئے رہِ راست پر چلنے کے لئے حیوان کی رسّی اِنسان کے ہاتھ میں

دیگئی۔ لیکن اُس اِنسان کو ہم کیا کہیں جس نے اِن عطیات کے ہوتے ہوئے اپنی رسّی دوسروں کے حوالہ کی۔ حیوانوں کیطرح وہ دوسروں کے پیچھے ہولیا۔ اخلاق میں۔ اعمال میں سیرت میں۔ الغرض ہر نقل وحرکت میں مسلمان اپنی چال بھول گئے

صبغۃ اللہ

کو چھوڑ کر دوسروں کے رنگ میں رنگین ہو گئے۔ تمہارے نزدیک یہ تہذیب ہوگی۔ لیکن ہماری نگاہ میں تو تم من یمشی مُکبا علی وجہہ کے مصداق ہو۔ تم اُس دِن اِنسان کہلاؤ گے۔ جب تمہاری رسّی تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔ جب تمہاری گردن سویّا کا رنگ اختیار کریگی۔ اپنے راستہ کی تلاش کے لئے تم اپنی آنکھیں آپ استعمال کروگے۔ جب اخبارِ دُنیا پر محاکمہ کرنے کے لئے تم اپنے کان آپ استعمال کروگے۔ اور دوسروں کے بتائے ہوئے واقعات کو سُنا لوحی نہ سمجھوگے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا کا دوسرا حصّہ اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ فرمایا۔

”ہمنے تمہیں آنکھ دی۔ کان دیئے لیکن تمنے بہت کم شکر گزارا۔“

شکر گزارنے سے مُراد بار بار الحمد للہ کا زبان پر لانا نہیں۔ بلکہ اُن عطیّاتِ ربّی کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہے۔ تم آنکھ کان اور دل کے لئے دِن میں لاکھ دفعہ خدا کی حمد وستائش کرو پھر بھی تم سے بڑھ کر کوئی اور کافرِ نعمت نہیں ہوسکتا اگر تم نے

اپنی آنکھ اور کان اور دل کا استعمال اپنے لئے خود آپ نہیں کیا۔ بلکہ انہیں معطل کر کے دوسرے کی آنکھ کان کو اپنا رہنما بنایا۔ دیکھو کس خوبصورتی سے اس آیت میں حیوان و انسان کی گردن و سر کیطرف اشارہ کر کے انسان کی آنکھ کان اور دل کا ذکر کر دیا۔ بات یہ ہے۔ کہ انسان کے حواس خمسہ میں باقی حواس کے مقابل بینائی اور شنوائی ہی حصول علم کا بہترین ذریعہ ہیں۔ یہی دو اعضاء واقعاتِ عالم جمع کر کے دل کے آگے پیش کرتے ہیں جن پر دل محاکمہ کر کے انسان کے آئندہ افعال و اعمال کو مختلف سانچوں میں ڈھال دیتا ہے +

الغرض جو انسان اپنا دِل دماغ اپنی آنکھ کان خود استعمال کرنا نہیں جانتا یا نہیں کرتا۔ وہ اس فیصلۂ خداوندی کے ماتحت کالانعام ہے۔ اسکی رسی دوسروں کے ہاتھ میں ہے خدائیتعالیٰ اُسے دوسروں کا محکوم کریگا۔ دوسروں کا بوجھ اس کے سر پر ہوگا۔ وہ رات دن محنت شاقہ کریگا۔ اسکے سر کا پسینہ پاؤں تک پہنچیگا۔ لیکن اس محنت شاقہ کے ثمر کا صرف اسی قدر حصہ اسے ملیگا۔ جو قوت لایموت کا کام دیسکے بقیہ کُل کا کُل اسکی جیب میں جائیگا۔ جو اپنی آنکھ اور کان کو استعمال کرتا ہے۔ آج مسلمان اپنی حالت پر رو رہے ہیں۔

اپنی سلطنت ۔ قوت ۔ شوکت کا جنازہ اُٹھائے ہُوئے مصروفِ آہ وزاری ہیں لیکن وہ ایک منٹ کیلئے غور نہیں کرتے کہ یہ نکبت و فلاکت کسی اور نے ان کے لئے پیدا نہیں کی دشمنوں نے اُن کے گھر کو نہیں گرایا ۔ عمارت تو پہلے ہی گر رہی تھی ہاں جس کی نگاہ میں مسلم خود ہلاکت تک پہنچ چکا تھا ۔ اُسنے مرے کو مارے شاہ مدار کر دیا ۔ مُدّت سے مسلمانوں نے اپنے لیے غور کرنا چھوڑ دیا ۔ مُدّت سے ان میں قوتِ عمل مفقود ہے ایک عرصہ سے یہ قوم جذبات فاسدہ کی غلام ہو کر سمع و بصر کھو بیٹھی ہے ۔ تو پھر کیوں ان کی رسی دوسروں کے ہاتھ میں نہ جائے

"آنچہ بر ماست ہمہ از ماست"

لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت کا حکم آج ہم پر وارد ہو گیا اور وہ زبردست اور اٹل فتویٰ خداوندی جس کا اعلان تیرہ سو برس ہُوئے سب سے اول دنیا میں ان اللہ لا یُغیّر ما بقومٍ حتیٰ یغیروا ما بانفسھم کے الفاظ میں ظاہر ہُوا تھا ۔ آج ہم پر صادر ہو گیا ۔ قضاء و قدر نے ہمیں مجرم قرار دیکر ہم پر سزا ے لازم وارد کی +

لفظ بشارت جسے عبرانی میں انجیل کہتے ہیں اپنے اندر انذار کے معنی بھی رکھتا ہے یعنی کسی کو کسی بات سے ڈرانا ۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے ۔ تو انذار بھی ایک خوشخبری ہے کیسی

کو کسی خطرہ سے ڈرانا۔ دراصل اُسے مصیبت سے بچانا ہوتا ہے
اس سے بڑھ کر اور کیا خوشخبری کسی کے لئے ہو سکتی ہے۔ اگر اُسے
پیش از وقت آگاہ کر دیا جائے۔ کہ فلاں عمل اس کے حق میں
مفید یا مضر ہو گا۔ قرآن کریم نے لھا ما کسبت وعلیھا
ما اکتسبت کہ کر یہ خوشخبری دی۔ کہ اے انسان تیرے اپنے
ہی عمل تیرے لئے خیر و برکت ہونگے لیکن تو خود ہی اپنی مصیبت
اور عذلت کا باعث ہو گا۔ یہ وہ انجیل عمل ہے۔ کہ جس کے
آنے پر انسان ہر قسم کی توہم پرستی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسکے
کل قوے حرکت میں آجاتے ہیں۔ اس کا دل ہر قسم کے خوف و
خطرے سے آزاد ہو کر حقیقی اطمینان پالیتا ہے۔ وہ پوری
تسلی کے ساتھ ہر ایک کام کر سکتا ہے۔ جب تک انسان اپنی
بہبودی یا نقصان کو دوسروں سے وابستہ سمجھتا ہے اسے اپنے
قوٰی پر بھروسہ نہیں رہتا۔ اسکی اپنی ہمت ضائع ہو جاتی ہے
اسکی کل کی کل کوشش اسی پر آ رہتی ہے۔ کہ اس کے معبود
خداوندان نعمت یعنی وہ وجود جن سے وہ اپنے نفع و نقصان
کو وابستہ سمجھتا ہے اس سے خوش ہو جائیں۔ وہ سمجھتا ہے
کہ میری اپنی نقل و حرکت میری اپنی قوتوں کا استعمال میری اپنی
سب کوششیں سب کی سب بے سود ہیں۔ کیونکہ نفع و نقصان
تو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ میں لاکھ کوشش کروں۔ میں

کام کرتا کرتا مر جاؤں - یہ سب باتیں لاحاصل ہیں - جبتک وہ وجود جس کے ہاتھ میں میرا نفع و نقصان ہے راضی نہو اسلئے میری خیر و برکت اسی میں ہے - کہ میں اپنی کوششوں کو تو ایک طرف رکھوں اور سب سے پہلے اس وجود کے خوش کرنیکے سامان کروں - اس کا لازمی نتیجہ فقدان عمل ہوگا - اور اس سے کُل انسانی قوتیں ہلاک ہو جائیں گی - اپنے مفروضہ نفع و نقصان کے مالک کی خوشی انسان کا نصب العین ہوگی - وہ چڑھاوے منتوں - قربانیوں - کفاروں - سفارشوں کی تلاش میں لگ جائیگا - اپنے مفروضہ خداوندوں کے آگے جن میں بعض وقت حکام وقت بھی شامل ہو جاتے ہیں اپنے آپکو ذلیل سے ذلیل رنگوں میں پیش کریگا - پھر اس پر بھی اُسے کون یقین دلاسکتا ہے کہ اسکے معبود اس سے خوش ہوگئے ہیں - اُسے اب نقصان سے بچا کر ہر خیر و برکت کا مالک کردیں گے[1]+

کیا یہ حالت ہر جگہ ایسے انسانی قلب کی نہیں جس کا کامل بھروسہ اپنی ذات پر نہیں - بلکہ اُسکی نگاہ اپنے سُود و ضرر کے لئے دوسرے کی طرف ہے - اب اگر یہ انسانی قلب کا صحیح نقشہ ہے تو

[1] یہ سب کچھ کرکے حقیقی اطمینان پھر بھی اُسے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انکی طرف سے اطلاع نہیں ملتی کہ اس کے تذلل و انکسار نے انہیں خوش بھی کیا ہے یا نہیں +

اس سے بڑھ کر اور کیا خوشخبری ہو سکتی ہے۔ کہ اُس ذات کی طرف سے جس کے ہاتھ میں حقیقی طور پر نفع و نقصان ہے۔ جو ذرہ ذرہ کا مالک ہے۔ اور جس کی منشاء کے خلاف کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آتا۔ وہ خود انسان کو اطلاع دے۔ کہ تیری رنج و راحت تیرا نفع و نقصان کسی عنصر کسی مظہرِ قدرت شمس و قمر۔ نجم۔ دریا۔ درخت۔ حتیٰ کہ کسی اِنسان وہ پیر ہو یا فقیر۔ ولی ہو یا رشی۔ نبی ہو یا اوتار۔ شہری ہو یا حاکم۔ الغرض کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ تیرا نفع و نقصان انکی خوشی یا ناراضگی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ بکم ماکسبتم تو ہی اپنے نفع و نقصان کا پیدا کرنیوالا ہے۔ ہم نے خیر و شر کے اندازے مقرر کر دیئے ہیں وہ اندازے ہمارے اٹل ہیں۔ وہ ہی ہماری تقدیر ہے۔ فلاں چیز یا فلاں کام کے فلاں اندازے سے لازماً نیک نتیجہ پیدا ہو گا۔ اور فلاں اندازے سے لازماً شر ہو گا۔ یہی حقیقت تقدیر ہے۔ جس کو لوگوں نے کچھ اور سمجھ رکھا ہے۔ ان خیر و شر کے اندازوں کا ہم تجھے یا تو بذریعۂ الہام علم دیتے ہیں۔ یا تیرے لئے تحقیق کے مواقع پیدا کر دیتے ہیں۔ کہ جن سے تو خیر و شر کے اندازوں سے واقف ہو جائے۔ ان اندازوں کا علم حاصل کر۔ اُن کو

اپنے سامنے رکھ - تیرا نفع و نقصان - تیری رنج و راحت تیرے اپنے ہاتھ میں ہے - اگر تو خیر و برکت کے اسباب پیدا کریگا - تجھے نیک ثمرات سے کوئی روک نہیں سکتا بالمقابل اگر تو نے اسباب شر مہیا کئے تو پھر بد نتائج کے بھگتنے کیلئے تیار رہو جا - تجھے ان بد نتائج سے کوئی صدقہ کوئی فدیہ کوئی کفارہ کوئی سفارش نہیں بچا سکتی - ان بد نتائج سے بچنے کے بھی ہمارے بعض مقرر کردہ طریق ہیں لیکن ان پر بھی تجھے خود ہی عمل کرنا ہوگا - تب نجات حاصل ہوگی - یہ یاد رکھ کر جو کچھ ہماری طرف سے ہوتا ہے یا آتا ہے وہ سب خیر ہی خیر ہے - تیرا اپنا عمل ان چیزوں کو جو خیر محض تھیں تیرے لئے شر بنا دیتا ہے - یعنی تو ان چیزوں کے متعلق صحیح عمل نہیں کرتا - ہم نے تجھ پر ایک اور بھی مہربانی کر دی ہے - کہ جہاں تیری ایک بد عملی تیرے لئے ایک ہی نتیجۂ بد پیدا کریگی - وہاں تیرے ایک عمل خیر کے عوض تیرے ثمرات دس گُنے ہو جائیں گے - الغرض جو کچھ ہے تیرا اپنا عمل ہے - اور ہم نے اس قانون عمل کی اس قدر عزت کی ہے کہ قادر مطلق ہونے کے باوجود بھی ہم تیری حالت اچھائی یا بُرائی کی طرف نہیں بدلینگے - جب تک کہ کوئی عمل و حرکت نفع و نقصان کی طرف پہلے تجھ سے سرزد نہ ہو - سایہ کی طرح

تیری بھلائی اور تیری مصیبت اُسی ایک اور دس کی نسبت سے تیرے اعمال کے متعاقب رہیگی - یہ انجیل عمل ہے جو ہم تجھے دیتے ہیں - اپنے اعمال پر بھروسہ رکھ - کوئی اِنسان تجھے تکلیف نہ دیگا - تو کسی کے ماتحت پیدا نہیں ہوا - دُنیا کے حاکم و محکوم ایک ہی طرح اور ایک ہی قسم کی بے سروسامانی کے ساتھ یہاں آتے اور یہاں سے جاتے ہیں - حکومت اور محکومیت اُن کے اپنے اعمال کی دو شکلیں ہیں - رُوئے زمین کی ہر ایک چیز ہم نے تیرے لئے مسخر اور تیری خادم کردی ہے - لیکن اُن کی خدمت سے متمتع ہونے کے لئے پہلا قدم تیرا اُٹھنا چاہئے - فی الجملہ تیرے اعمال کے نتائج کے مرتب ہونے میں اور تو اور ہم خود بھی دخل نہیں دیتے ٭

"اِنَّ اللّٰہ لا یغیّر ما بقوم حتّٰی یغیّروا ما بانفسھم"

یہ خلاصہ ہے قرآن کی تعلیم کا - اسکو مذاہبِ سابقہ کی تعلیم سے مقابلہ کیا جائے - تو پھر ایک بیکدل انصاف پسند اِنسان اس نتیجہ پر آنے سے نہیں رکسکتا - کہ قرآن کریم کسقدر اِنسان کے لئے رحمت و برکت کا موجب ہُوا - اور قرآن کریم نے تنزیل من ربّ الرّحیم ہونے کا صحیح دعوےٰ کیا - کیونکہ تعلیم مندرجۂ بالا سے ہی اِنسانی قویٰ کی حقیقی ربوبیت ہوتی ہے - اسی تعلیم عمل پر

چلکر انسان کے مخفی کمال ظاہر ہوتے ہیں۔ اُس کی مضمرہ قوتیں ظاہر ہوکر دنیا کو کچھ کا کچھ بنا دیتی ہیں۔ دنیا جہان کی مخفی طاقتیں۔ زمین و آسمان کے چھپے ہوئے خزانے اِنسانی عمل سے ہی اِنسان کے قبضہ میں آجاتے ہیں۔ عمل سے ہی اِنسان علوم عالیہ حاصل کرکے اور پھر اُن علوم پر عمل کرکے خلیفۃ الارض ہوجاتا ہے۔ قوائے کائنات کی محرک کرنے والی طاقتیں جنہیں اِصطلاح مذہب میں ملائکہ کہا گیا ہے۔ اسی باعلم و باعمل اِنسان کے آگے سجدہ کرتی ہیں

وعلم آدم الاسماء کلھا .... فسجدوا الا ابلیس

جب آدم کو ہر چیز کے اسما (ان کے خواص وحقیقت) کا علم دیا گیا ...... تو پھر ابلیس کے سوا کُل ملائکہ نے اُسے سجدہ کیا +

وہ انقلابِ عظیم جو اسلام نے آکر دُنیائے مذہب میں پیدا کردیا۔ وہ یہی صداقت عمل تھی جسے قرآن نے کھول کھول کر بیان کیا۔ اسمیں شک نہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب بلکہ ہر قوم کا مذہب جو اسلام سے پہلے دنیا میں دائر و سائر تھا۔ وہ سب حسب تعلیم قرآن خدا کی طرف سے تھے۔ اور ان میں بھی تعلیم عمل تھی۔ شریعت موسوی۔ ہندوؤں کے ہاں کرم کانڈ۔ ایسا ہی گیتا میں خود کرشن کی

تعلیم یہ سب عمل کی طرف ہی اشارہ کرتی ہیں لیکن پھر بھی مذاہب سابقہ کے ماننے والے قوّت عمل کی حقیقت سے آشنا نہ ہوئے۔ اور توہم پرستیوں نے اُنہیں مختلف قسم کے شرکوں میں مبتلا کر دیا +

علاوہ ازیں انسانی فطرت میں ایک بھاری نقص یہ ہے کہ وہ محنت کا چور ہے۔ وہ تن آسانی کا عاشق ہے اسلئے لازمًا وہ کئے کرائے کام کا مالک ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنے بوجھ کو دوسروں کی گردن پر دیکھنے سے خوش ہوتا ہے۔ اس سے قوت عمل کمزور ہو جاتی ہے۔ اور مسئلۂ کفارہ یا شفاعت غلط معنوں میں انسانی طبیعت کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔ جس طرح ہم محنت سے بچنے کے لئے سنگ پارس یا کیمیا کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ جس سے ہماری غرض یہی ہوتی ہے۔ کہ ہم سنگ پارس کے ذریعہ لوہے یا کسی اور کم قیمت دھات کو سونا بنا کر آیندہ کی محنت اور کلفت سے بچ جائیں۔ اور بلا عمل دُنیوی چین اُڑائیں۔ یہی رنگ بعض وقت ہمارے مذہبی معتقدات میں بھی آ جاتا ہے۔ یورپ بھی اس مرض کیمیا گری میں چار پانچصدی پہلے مبتلا تھا لیکن آج وہ اس غلطی سے نکل گیا۔ اور اس نے سنگ پارس سے نہیں بلکہ کیمیائے عمل سے لوہے کو سونے سے بھی گراں

کر کے بیچا۔ لیکن جہاں مادّیات میں مغرب نے کیمیائے عمل کی حقیقت کو سمجھ لیا۔ رُوحانیات میں ابھی تک یورپ کے لوگ ایام وسطیٰ کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی تک ایمان رکھتے ہیں۔ کہ مادیات میں تو نہیں مگر روحانیات ایک بات پر سنگ پارس کا عمل رکھتا ہے۔ اور وہ مسیح کا خون ہے۔ اس پر ایمان لانے سے اُن کی پست فطرت نیک فطرت میں متبدل ہو جاتی ہے۔ ان کے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ اور وہ بہشت کے مالک بن جاتے ہیں +

اِس مسئلہ کفارہ مسیح سے جسقدر قوت عمل ضائع ہو کر احساس ذمہ داری انسان میں مرجاتا ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ واقعات یہ ثابت نہیں کرتے کہ بپتسمہ پانے سے اِنسان میں قوت گناہ زائل ہو جاتی ہے۔ ہاں بالمقابل کفارہ کے بھروسہ نے یورپ کو گناہ کرنے میں دلیر کر دیا۔ اس سے ہر قسم کے مظالم اور اباحتیں سرزد ہوئیں۔ وہ بعض بدیوں میں دنیا سے سبقت لیگیا۔ اگر مسیح کی زندگی اور مسیح کی تعلیم انسان کے لئے ایک ضروری اُسوۂ حسنہ ٹھیر سکتا ہے۔ جیسیکہ مسیحی معلموں کا خیال ہے۔ تو پھر روز روشن میں مشعل جلا کر یورپ کے گلی کوچہ کو یورپ کے کلیسوں کو۔ یورپ کے مُدبران سلطنت کے دفاتر کو دیکھا جائے۔ تو ان میں کہیں مسیح نظر نہ آئیگا۔ کیا یہ یُورپ

کا جنگ - یورپ کا یہ طریق جہانبانی جہانتک رنگ و قوم کا سوال ہے - ان کی معاشرت - ان کے تعیشات النسانیت میں کہیں بھی مسیح کی زندگی کا نام ہے ؟ یورپ کو مسیح کی زندگی سے تعلق کیا - یہ سب اسی لئے ہوا کہ مسئلہ کفارہ نے عمل کی ضرورت کو مفقود کر دیا - وہ کیوں مسیح کی نقل کریں - جب ضرورت عمل ہی نہیں - مسیح کے مذہب کے لئے وہ روزبد تھا جس دن پولوس نے اسمیں شامل ہو کر مسئلہ کفارہ کی بنیاد رکھی - اور شریعت و عمل کو لعنت قرار دیا - لوتھر جیسے عقلمند انسان نے بھی اس مسئلہ میں غلطی کھائی - اس نے بھی خونِ مسیح پر ایمان کے ہوتے ہوئے عمل کو غیر ضروری سمجھا - وہ اور کیا کر سکتا تھا - جب ایک انسان کی نجات کے لئے مسیح کی صلیب پر ایمان لانا کافی سمجھا جائے اور اس کا خون بدعملیوں کو دھو سکے - تو پھر نیک عمل کی حاجت نہیں رہتی - لیکن آج تجربہ نے ثابت کر دیا کہ شریعت اور عمل جسے پولوس نے لعنت قرار دیا وہ تو لعنت نہ تھے - وہ حقیقی برکت تھے - مگر وہی مسئلہ کفارہ نسل انسانی کیلئے لعنت بنا +

کیا قسمت کا اُلٹ پھیر ہے - کہ وہی عیسائی قوم جو روحانیات میں شریعت و عمل کی قائل نہیں - ان کی سلطنت ان کی تمدن و

تہذیب اُن کی ترقّی و اقبال سب کے سب شریعت وعمل کی طفیل ہے۔ کیونکہ شریعت مُترادفِ قوانین ہے۔ وہ کونسی عیسائی سلطنت ہے۔ جو قانون سے وابستہ نہیں۔ مناسب تو یہ تھا کہ یہ لوگ یا عیسائی مذہب کو چھوڑتے یا واضعانِ قانُون کی کُل مجالس کو اُٹھا دیتے۔ مجسٹریٹوں کو اور عدالتوں کے حُکّام کو جواب دیدیتے۔ کیونکہ قانون اور شریعت بقول پولوس لعنت تھی +

عیسائی تھیالوجی کا بُنیادی مسئلہ دراصل یہی ایک مسئلہ ہے جو عمل کو لاشئے قرار دیتا ہے۔ اور یہی مسئلہ اسلام اور عیسائیت میں مابہ الامتیاز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان شریعت یا قانونِ الٰہی پر چلنے کے قابل ہی نہیں۔ اسلئے وہ گناہ کرتا ہے۔ اور مستوجب سزا ہو جاتا ہے۔ جس سے بچنا ایک کفّارہ چاہتا ہے۔ کیونکہ عدل سزا دیئے بغیر انسان کو نہیں چھوڑ سکتا۔ انسان خود سزا پائے یا اسکی جگہ کوئی سزا اٹھائے۔ بالمقابل گناہگار انسان کا کفّارہ کوئی اور انسان نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ خود گنہگار ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک خدا کے سوا اور کوئی انسان معصوم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے خدا ہی کفارہ ہوسکتا ہے۔ جس سے مسیح کی اُلوہیت کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ عیسائی فسانہ کا

خلاصہ ہے۔ الغرض عیسائی مذہب کی ساری بنیاد اس ایک بات پر آ رہتی ہے۔ کہ انسان میں شریعت پر چلنے کی استعداد نہیں یعنی اسمیں قوّتِ عمل نہیں جو بالبداہت ایک باطل امر ہے۔ اگر ہم میں قوّتِ عمل نہو یعنے ہم میں قانون پر چلنے کی استعداد ہی نہو۔ تو پھر نہ مقننین کی ضرورت رہتی ہے۔ نہ کوئی حکومت ہی قائم رہ سکتی ہے۔ اس موقعہ پر یہ کہا جاتا ہے۔ کہ عیسائی تھیالوجی میں اگر یہ مانا گیا ہے۔ کہ انسان میں قانون پر چلنے کی طاقت نہیں تو اس سے مُراد دنیاوی قوانین نہیں بلکہ ربّانی قوانین ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کس مقام پر ہم دُنیاوی اور ربّانی قوانین میں فرق کر سکتے ہیں۔ دُنیا کی بہبودی کے لئے کوئی بھی ایسا قانون وضع نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد کسی آلہی قانون پر نہ ہو۔ اور باتوں کو چھوڑ دو کونسا قانون کسی گورنمنٹ کا ہے جسمیں موسیٰ کے دس احکام شریعت نظر نہیں آتے +

یہ سب ایّام وسطی کی جہالتیں اور توہم پرستیاں ہیں۔ آج جو کچھ یورپ کو حاصل ہوا قوّتِ عمل سے حاصل ہوا۔ اگر یوروپین تمدّن سائنٹفک انکشافات سے وابستہ ہے تو پھر سائنس تو قوانین فطرت کے دریافت کرنے کا نام ہے جن پر چلکر دُنیا کچھ کی کچھ ہوگئی ہے۔ الغرض جس نعمت عظمےٰ

کی خبر قرآن کریم نے انسان کو دی۔ یعنی عمل اور اسکی قوت
اس پر سب سے اول مسلمان قدم زن ہوئے۔ جس سے
انہیں فوق العادت ترقی حاصل ہوئی۔ مگر بعد میں جس کو
چھوڑ کر وہ ادبار کے گڑھے میں گر گئے۔ بالمقابل یورپ نے
اس نعمت کو مسلمانوں سے لیلیا۔ یورپ نے انجیل عمل کو
قبول کیا۔ اور مادی معاملات میں وہ حاصل کیا جسکا وعدہ
قرآن مجید نے مومنوں کے ساتھ اس دنیا میں کیا ہے۔ کیا
عجیب بات ہے۔ جس مذہب نے عمل پہ زور دیا۔ اور ہر ایک
دینی دنیوی خیر و برکت عمل سے وابستہ کی۔ اس کے پیرو عمل
چھوڑ کر دنیا میں ذلیل ہو گئے۔ اور جس قوم کے مذہب نے
عمل کو لعنت قرار دیا۔ انہوں نے اس تعلیم کو دنیوی ترقی
کے لئے لعنت سمجھ کر اس پر لعنت بھیجی۔ اور اسمعاملہ
میں تعلیم قرآن کو عملاً قبول کیا۔ اور ان ثمرات کے مالک ہو گئے
جن کا وعدہ اس دنیا میں کتاب حمید کرتی ہے مسئلہ عمل میں
الغرض مسلمان پولوس کے شاگرد بن گئے۔ اور پولوس کے
پیرو مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

عیسائی اپنی کتب مقدسہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے
ہیں۔ جو کتابیں کتاب پیدائش یا خمس موسیٰ سے چلکر ملاکی
نبی کی کتاب پر ختم ہوتی ہیں۔ اُسے پرانا عہد نامہ کہتے ہیں

باقی کتب یعنی انجیل متی سے لے کر مکاشفات تک نئے عہد نامہ کے نام سے موسُوم کی جاتی ہیں۔ اس تقسیم سے مُراد برُوئے عقیدہ عیسائیت مذہب انسانی کے وہ دو پہلوُ ہیں۔ جو برُوئے تعلیم کلیسیا خدائیتعالےٰ نے انسان کی نجات کے لئے پسند کئے۔ ان کے نزدیک پہلا پہلو شریعت کا تھا۔ یعنی وہ عہد جو جناب موسیٰ کی معرفت نسل انسانی کے ایک حصّہ سے ہوُا۔ یعنی خدا نے موسیٰ کی معرفت انسان کو قوانین دیئے جن پر عمل پیرا ہوتا اُسے نجات تک پہنچا سکتا تھا۔ یعنی انسان کی نجات کو خدائیتعالےٰ نے عمل سے وابستہ کیا۔ چند صدیوں کے تجربہ نے خدائیتعالیٰ پر ثابت کر دیا کہ اس سے غلطی ہوئی۔ کیونکہ انسان اس عہد میں پوُرا نہ اُترا۔ اس لئے مسیح کے آنے پر انسانی نجات کے لئے مذہب عمل کو چھوڑ کر انسان کو انجیل فضل عطا فرمائی انسان کی غلط کاریوں کے عوض میں ایک بڑا بھاری فدیہ لیلیا گیا۔ ایک معصوم کو صلیب پر کھینچا گیا۔ جس کے خون نے انسانی گناہ دھو ڈالے۔ اور اس کفارہ نے انسان اور خدا میں مصالحت کرا دی ہے۔ جس پر خدائیتعالےٰ نے تجدید عہد کی۔ کہ جو اس کفارہ پر ایمان لائیگا وہ نجات پائیگا۔ اس لئے اس کا نام

نیا عہد نامہ ٹھہرا۔ یعنے عہد نامۂ قدیم تو معاہدۂ عمل تھا
اور عہد نامۂ جدید معاہدۂ ایمان ٹھہرا۔ جس میں عمل کی
ضرورت نہ رہی +

دراصل اسلام و مذہب کلیسیاء سے سوا کُل مذاہب
دیگرہ میں ایک طرف اور مذہب کلیسیا میں دوسری طرف
اگر فرق ہے تو صرف اسی قدر ہے۔ کہ اسلام اور کل مذاہب
دیگر تو انسانی نجات کو عمل سے وابستہ کرتے ہیں۔ اور مذہب
کلیسیا صرف کفارہ مسیح پر ایمان لانے کو نجات کے لئے کافی
سمجھتا ہے۔ ہم نے ارادتاً اس انوکھے مذہب کا نام مذہب
کلیسیا رکھا۔ کیونکہ جناب مسیح بھی مذہب عمل و شریعت
کے پابند تھے۔ اپنے خطبۂ کوہی میں بھی انہوں نے شریعت
پر زور دیا۔ اُن کے نزدیک خداوند کی بادشاہت میں انسان
عمل سے ہی داخل ہوسکتا تھا۔ جب کبھی کوئی اُن کے پاس
نجات کی راہ پوچھنے آیا۔ اُنہوں نے شریعت و عمل کی طرف
رہنمائی کی۔ اُنہوں نے اپنے ذاتی کمالات کے حصول کا
دروازہ بھی نماز روزہ اور عمل ہی بتلایا۔ الغرض عمل پر ہی
اُن کا ایمان تھا۔ اور ان کی تعلیم بھی یہ ہی تھی۔ انہوں نے
کبھی یہ نہ اشارہ کیا۔ کہ اب عہد شریعت ختم ہوچکا۔ اب
عہد فضل میرے ساتھ شروع ہوُا۔ میں عنقریب تمہارے

گناہوں کے عوض میں پھانسی پر چڑھنے والا ہوں تمہاری گذشتہ اور آیندہ بدعملیوں کا میں کفارہ بننے والا ہوں تمہیں اب عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے کفارہ پر ایمان لاؤ اور نجات پاؤ۔ حیرت کا مقام ہے کہ اگر بعثت مسیح نے عہد عمل کو منسوخ کر دینا تھا۔ تو کیا آپ کی ذات مقدس ہم سے مضحکہ کرنی ہے جو اسقدر شریعتِ عمل پر زور دیتی ہے ۔

پھر اس انوکھے مذہب کو عہد فضل کہنا ہی غلط ہے وہ عقیدہ جس سے انسان بے عمل ہو جائے۔ جس سے احساس ذمہ واری میں کمی پیدا ہو جائے۔ جس سے انسان کے قوے میں جوش پیدا نہ ہو وہ فضل نہیں ہو سکتا۔ وہ لعنت ہے اسی طرح اس نئے طریقہ نجات کا نام عہد جدید رکھنا بھی جہالت کا اظہار کرتا ہے کلیسی عقاید میں ہمیں تو ایک بات بھی نظر نہیں آتی جس کا وجود قدیمی توہم پرستیوں میں موجود نہ ہو۔ انسان کا گناہ کر کے خدا کا مورد غضب بننا۔ اس کے غضب سے بچنے کیلئے انسان کا مختلف قسم کی قربانیاں تجویز کرنا۔ ان قربانیوں میں بعض جگہ انسانوں تک کا مذبح پر چڑھایا جانا یہ ایک داستانِ پارینہ ہے۔ جو مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے مصر میں ہند میں۔ ایران میں۔ یونان میں موجود تھی۔ جناب مریم (صدیقہ) سے پہلے بھی کنواریاں بعض انسانوں کی

مائیں بنیں۔ اور بعض ایسے باکرہ زادے خدا اور نیم خدا ٹھیرے جس کے شاہد حال یونانی فسانے موجود ہیں۔ ہندوستان میں چندر اور سورج بنسی خاندانوں کا آغاز بھی دو کنواریوں سے ہوا۔ یہاں ہمیں جناب مسیح کی ولادت کو زیر بحث لانا مدنظر نہیں۔ نہ ایک مسلمان مریم بتول کی عصمت پر مذہباً حرف گیر ہو سکتا ہے۔ ہمیں صرف یہاں اسی قدر دکھلانا ہے کہ مذہب کلیسیا کے پہلے بھی کنواریوں کے بطن سے بعض انسان پیدا ہو کر مخلوق کے خدا بن چکے ہیں۔ دوسری طرف جانور یا انسان کے خون سے خدا یا کسی دیوتا کے غصہ کا فرو ہونا۔ اور اس سے انسانوں کا نجات پا جانا ایک پرانا فسانہ ہے۔ پھر اسے انجیل جدید کہنا یا نیا عہد ٹھیرانا جہالت کا اظہار نہیں تو اور کیا ہے۔

اس موقعہ پر ایک اور اعتراض بھی خدائے تعالیٰ کی ربوبیت پر آتا ہے۔ رب العالمین کے فضل کسی قوم ملک یا مذہب سے وابستہ نہیں۔ وہ سب کا خالق ہے۔ اور ہر ایک مخلوق کا یکساں حق اُس کے فضل پر ہے۔ وہ ربانی برکات کی تقسیم میں غیر جانبدار ہے اور ہونا چاہیئے۔ اگر اس نے جسمانی پرورش کے لئے ایک ہی قسم کے سامان سب کو عطا کئے۔ تو پھر مذہب کے دینے میں جو جسم سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ یعنی رُوح کی پرورش کے لئے عطا ہوا ہے وہ کیوں جانبداری کرے۔ وہ عالم الغیب ہے۔ اور اگر

مذہب کلیسیا سچا ہے تو اُسے جان لینا چاہیئے تھا۔ کہ انسان شریعت پر عمل نہیں کر سکیگا۔ اگر بقول پولوس شریعت لعنت تھی تو اس لعنت کے ماتحت اُس نے کیوں دنیا کو جناب مسیح کی پیدائش تک رکھا۔ اُسے چاہیئے تھا۔ کہ جو مذہب فضل اُس نے مسیح کی معرفت دیا وہ پہلے ہی روز ہر ایک قوم کو دیدیتا۔ آخر جس گناہ نے انسان کو ہلاک کیا۔ وہ تو آدم سے سرزد ہوُا تھا۔ چاہیئے تھا کہ یا تو باغ عدن میں اسی دن خدا مسیح کی شکل میں آکر مصلوب ہو جاتا۔ یا جس ملک میں کوئی مذہب دیا گیا تھا۔ وہاں بھی ایک ایک مسیح مصلوب ہو جاتا۔ مصلوب تو خود خدا کو ہونا تھا۔ وہ ہر مُلک میں کسی مریم کے ذریعہ پیدا ہو سکتا تھا۔ خدا کا فضل تو عالمگیر ہوتا ہے۔ اس کے کیا معنی کہ ہزاروں برس سے انسان ہر مُلک و دیار میں تو شریعت کی لعنت تلے ہے۔ کیونکہ کسی ملک کے مذہب کو دیکھ لیا جائے وہ مذہب عمل و شریعت ہے۔ صرف دو ہزار برس سے وہ ایک نیا طریق نجات تجویز کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ پہلا طریق نجات نہایت کٹھن اور مشکل ہے۔ اور دوسرے طریق میں تو کوئی دقت ہے ہی نہیں۔ بقول لیوتھر۔ ایمان لاؤ اور اعمال بے نجات پاؤ۔ لہٰذا یہ خاص جانبداری ہے۔ جو شان ربوبیت عالم کے منافی ہے۔ سابقین کو کیوں مصیبت عمل میں ڈالا گیا۔

اور متاخرین کی نجات کیوں اس طرح آسان کر دیگئی۔ پھر متاخرین میں سے بھی ان لوگوں کی نجات کا کیا سامان کیا گیا جنھوں نے کبھی مسیح کا نام تک نہیں سُنا۔ یہ مانا کہ آج یورپ کے یاجوج ماجوج نے دنیا کے کسی حصہ کو نہیں چھوڑا۔ مگر آج سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے تو صدہا قومیں دنیا میں ایسی موجود تھیں جنہوں نے خواب میں بھی اس عہد جدید یا عہد فضل کو سُنا نہ ہوگا۔ اگر واقعہ صلیب نے عہد قدیم کو منسوخ کرکے ایمان بر صلیب کو ہی مختصاً طریق نجات ٹھیرایا۔ تو پھر ان ناواقف قوموں کو کس گناہ کے عوض میں دوزخ میں دھکیلا گیا؟

در اصل کلیسیا کی تھیالوجی ایک یونانی فسانہ کا دوسرا رنگ ہے۔ یہ وہی شخص مان سکتا ہے جو دائرہ علم و عقل کو دائرہ مذہب سے جدا رکھے۔ اصل میں کلیسی عقائد یا دوسرے مذاہب و ملل کے عقائد جو طرح طرح کی باطل پرستیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ حقیقت نجات سے ناآشنا ہیں۔ یہ شاید یہ سمجھے ہوئے ہیں۔ کہ اس زندگی کے بعد کوئی خاص جگہ ہے۔ جسمیں ہر طرح کی آسائش ہے جہاں کا داخلہ ایک ذات کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہماری بدعملیوں سے بہت بگڑا ہوا ہے۔ اسکی آتش غضب بھڑک اٹھی ہے جس کے فرو ہونے پر ہی وہ کسی انسان کو اس آسائش کی جگہ میں جانے کی

اجازت دے سکتا ہے۔ جس طرح یہاں نذر۔ سفارش یا فدیہ سے کام چل سکتا ہے۔ وہاں بھی کسی قربانی۔ کفارہ سے بدعملی کا عوض ہو سکتا ہے۔ چلو اگر ہم نے گناہ کیا۔ تو ہم میں سے کسی نے سزا بھگت لی ؛

اب اگر حقیقت نجات یہی ہے۔ تو پھر طریق نجات بھی اسی قسم کا تجویز ہو گا۔ لیکن بہشت یا فلاح جو قرآنی اصطلاح میں موت کے بعد ایک کامیاب زندگی کا نام ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان کے اندر کی استعدادیں مرنے کے بعد اس ترقی کو حاصل کرنے لگیں جو انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ ہے۔ انسان کے اندر جو ملکوتی اور ربانی صفات ہیں انکا ظہور تام تو اس دنیا کو چھوڑنے پر ہو گا لیکن ان استعدادوں کو ترقی بعد الموت کے شاہراہ پر گامزن کرنے کی قابلیت انسان نے اس دنیا میں حاصل کرنی ہے۔ اسلئے اس عالم کا نام مزرعہ آخرت رکھا گیا ہے۔ اس استعداد کے پیدا کرنے کیلئے خدا تعالیٰ انسان کو ایک دستور العمل دیتا ہے جس کا نام مذہب یا شریعت ہے۔ اب اگر نجات یا فلاح کی حقیقت یہ ہے تو پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کسی کا فدیہ۔ سفارش یا کفارہ ہمیں کس رنگ میں مفید ہو سکتا ہے۔ نجات تو اس بالقوہ استعداد کے بالفعل ہونے کا نام ہے۔ جو ہمیں دوسرے جہان میں ترقی پر ترقی کرنے کے قابل کر دیگی۔ تو پھر کسی کا پھانسی پر چڑھنا ہم میں وہ استعداد

کیسے پیدا کر دیگا۔ اگر کسی حکیم یا ڈاکٹر کا اپنا سر پھوڑنا یا اپنی آنکھ نکال لینا کسی کی درد سر کو دور کر سکتا ہے۔ یا ایک اندھے کو بینا کر سکتا ہے تو پھر کفارہ مسیح کے قبول کرنے میں کوئی دقت ہمیں نظر نہیں آتی۔ یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ جنت یا بہشت اگر کوئی ایسی جگہ ہے کہ جس کی نعماء سے متمتع ہونے کیلئے بھی کسی خاص قسم کے خواص اور اعضاء کی ضرورت نہیں بلکہ وہاں داخل ہونے کے لئے خدائیتعالے نے کوئی شرط لگادی ہے۔ جس نے وہ شرط پوری کر دی۔ اس سے وہ خوش ہو گیا اور اس کے عوض میں اس نے داخلۂ بہشت کا ٹکٹ اسے دیدیا۔ تو پھر جو اس شرط کو پورا نہیں کر سکا۔ اس کے لئے لازماً وہی راہیں ہیں جو مختلف مذاہب باطلہ نے تجویز کر رکھی ہیں۔ یعنی سفارش۔ فدیہ۔ کفارہ۔ جہالت اور توہم پرستی نے عیسائیت سے بہت پہلے سب کے سب یہ طریق تجویز کر رکھے تھے۔ کلیسیا نے بھی ان ہی باتوں کو بہ تبدیلیٔ نام و مکان وزبان اپنی تعلیم میں داخل کر لیا۔ اور بات بھی ٹھیک ہے۔ جب معاملہ سفارش پر ہی آرہا۔ اور پھر عیسیٰ کیا اور رامچندر کیا۔ لیکن اگر جنت وہ ہے جو زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی ہے جیسے کہ فرمایا۔ عرضها السمٰوات والارض۔ ہاں اسکے نعماء سے متمتع ہونے کے لئے خاص حواس کی بھی ضرورت ہے وہ ہم میں

مضمر تو ہیں۔ لیکن ان کا ظہور دوسری زندگی میں ہوگا۔ اور صرف اسی انسان میں جو ایک خاص دستور العمل پر یہاں چلیگا۔ اور یہ وہ حقیقت جنت ہے۔ جو قرآن کریم میں بتلائی گئی ہے تو پھر جس نے دستور العمل کو پس پشت کر کے اُن مخفی استعدادوں کو روشن نہیں کیا۔ اسمیں وہ استعدادیں کسی سفارش یا کفارہ سے کس طرح پیدا ہو سکتی ہیں مثلاً گانے کا سُننا۔ موسیقی کی مختلف شکلوں سے حظ اُٹھانا ایک خاص مذاق سلیمہ چاہتا ہے۔ یہ مذاق استعداداً ہر ایک انسان میں موجود ہے لیکن وہی انسان فنون موسیقی سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ جو اپنے کانوں کو مختلف راگ و راگنیوں سے آشنا کرے۔ مختلف گتوں اور ترانوں سے واقف ہو۔ وقت وقت کے راگ اور سُر سمجھے۔ زیر و بم سے آشنا ہو۔ اب جس نے کسی دستور العمل موسیقی پر نہ چلکر مذاق سلیم پیدا نہیں کیا۔ اگر وہ سفارش فدیہ یا کفارہ دینے پر کسی اُستاد موسیقی کے گانے سے پورا محظوظ ہو سکتا ہے۔ تو نجات اور مُکتی کی وہ تصویریاں جو عیسائیت اور دیگر مذاہب باطلہ تجویز کرتے ہیں سب کی سب صحیح و درست ہیں۔ اور اگر یہ بات نہیں تو پھر اس دُنیا میں ہی نجات اور آیندہ کی نجات اسی ایک بات سے وابستہ ہے جس کا نام عمل ہے +

بظاہر ان اوراق کے پڑھنے والے کو یہ معلوم ہوگا۔ کہ میں

اپنے موضوع سے کسی قدر دور ہو گیا ہوں۔ مقصد تو اس کتاب کا مسلمانوں کو اس غلطی سے نکالنا ہے۔ جس سے انہیں فقدانِ عمل پیدا ہو گیا ہے۔ اور جس سے یہ سب کی سب مصیبتیں ہم پر مسلط ہو گئی ہیں۔ لیکن میں نے جو یہاں بعض ان مسائل کا کچھ ذکر کر دیا۔ جو عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسکی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو بالخصوص یہ قوم میرے سامنے ہے میری ہر تحریر و تقریر میں رُوئے سخن کا ان کی طرف پھر جانا لازمات سے ہے۔ دوسرا یہ جو باتیں میں نے عیسائیوں کے معتقدات کے رنگ میں بیان کی ہیں۔ وہ وہی ہیں جن پر مسلمان عملاً گام زن ہیں۔ اس کتاب کے مسلمان پڑھنے والے خدارا اپنی حالت پر غور کریں۔ اور دیکھیں کہ ان میں کس قدر قوتِ عمل کی کمی ہے۔ اور اس کا بڑا باعث ان کی وہ باطل پرستیاں ہیں۔ جن میں وہ پڑ گئے ہیں۔ مسلمان یاد رکھیں کہ جب تک اُن میں اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کی طاقت پیدا نہ ہو گی۔ جب تک وہ دوسروں سے بے نیاز ہونیکی عادت نہ ڈالینگے جب تک وہ اپنی خداداد طاقتوں کو استعمال کرنے کے خوگر نہ ہونگے جب تک وہ ہمسایہ کی مدد سے بہشت میں جانے کو عقوبتِ دوزخ کے برابر نہ سمجھیں گے۔ وہ دُنیا میں بحیثیت قوم اب زندہ نہیں رہ سکتے۔ وہ مر چکے۔ وہ اپنے ہاتھ سے اپنی موت کو اپنے اُوپر

وارد کر چکے ہیں۔ وہ حالتِ اضطراری میں دیوانہ وار ادھر اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ کیوں وہ اپنی سمجھ اور عقل سے کام نہیں لیتے۔ انہوں نے اپنی رسّی کو دوسروں کے ہاتھ میں دیدیا۔ یہ لچھن زندگی کے نہیں۔ یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ مسئلہ توحید تمہیں اسلئے نہیں سکھلایا گیا تھا۔ کہ کسی مخلوق کو تختِ الوہیت پر بٹھانے سے خدا کا کچھ بگڑتا تھا۔ یا اس کا حصہ بھر ہاس اٹھتا تھا۔ فمن کفر فان اللہ غنی عن العالمین۔ تم مشرک بن کر خدا کا کچھ نہیں بگاڑتے۔ تمہیں اگر شرک سے روکا گیا۔ تو اس لئے کہ کسی غیر اللہ پر بھروسہ نہ کرو۔ اور اپنی خداداد طاقتوں کو ان امور کے حاصل کرنے میں استعمال کرو۔ جس کے لئے تم پیر یا فقیر مناتے ہو۔ پیر پرستی یا گور پرستی سے تمہیں اس لئے نہیں روکا گیا۔ کہ وہ بزرگ معاذ اللہ قابلِ عزت نہیں۔ جن کے تم مُرید ہو یا جو ان قبروں میں لیٹے ہوئے ہیں صرف اس ہی لئے یہ باتیں منع کی گئیں کہ جو ضرورتیں تمہیں ان کے پاس لیجاتی ہیں۔ تم خود اُن کے دفعیہ کا انتظام کرو۔ تم ان کے پاس جاکر اپنی قوتِ عمل کو زائل کردیتے ہو۔ یہ وہ امور ہیں جن پر ہم اپنی کتاب حقیقتِ توحید میں مفصل بحث کریں گے۔ یہاں ہمیں صرف اسقدر ذکر کردینا ہے کہ ہم میں سے اب پیر پرستی تو کم ہوتی جاتی ہے۔ لیکن ہم ہمسایہ پرست ہو گئے ہیں۔ ہم ہمسایہ قوموں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

ان کے اشارہ پر ناچ رہے ہیں۔ اور ان باتوں کے دفعیہ کی فکر
میں نہیں رہتے۔ کہ جس نے ہمارے قویٰ پر فالج گرایا ہے۔ کیا ہم
اپنے قدم پر کھڑے ہونے کے قابل ہیں؟ اگر نہیں تو پھر انگریز
نہ سہی ہندو سہی ہمیں ایک نہ ایک کی غلامی کرنا ہے۔ میں یہ نہیں
کہتا کہ تم برادرانِ وطن سے نہ ملو۔ اسلام تو امور مشترکہ میں
کسی غیر مسلم کے ساتھ ملکر کام کرنا ہمیں حکماً سکھلاتا ہے۔ پھر
امورِ سیاسی میں تمہیں شرکت ہمسایہ سے کون روکتا ہے سوال
تو یہ ہے کہ آیا تم خود بھی کسی قابل ہو؟ کیا تمہاری تعداد آٹھ
یا دس کروڑ کی کچھ کم تعداد ہے؟ تم کس کے محتاج ہو؟ آٹھ کروڑ
تو بڑی چیز ہے۔ دنیا میں تو آٹھ سَو بلکہ اتنی جانباز کافی سے
زیادہ ہیں۔ کیا تم نے آثار میں نہیں پڑھا۔ کہ اگر چالیس مومن
دُنیا میں ملکر کام کریں تو دنیا کو ہلا سکتے ہیں۔ تم تو آٹھ یا نو کروڑ
ہو۔ ہاں سوال یہ ہے کہ تم مومن بھی ہو یا نہیں؟ اگر تم مومن
ہوتے تو تمہاری یہ حالت نہ ہوتی۔ تمہارے ساتھ نصرت خداوندی
نہیں۔ تمہارے اردگرد ذلت و مسکنت منڈلا رہی ہے۔ تم جو قدم
اُٹھاتے ہو وہ شکست کی طرف جاتا ہے۔ اب اگر قرآن کا یہ کہنا
صحیح ہو کہ وکان حقًا علینا النصر المومنین یعنے مومن کو نصرت دینا
خدائے تعالےٰ کے ذمہ ہے۔ تائید مومن فرض خداوندی ہے۔ پھر اس
آیت کے ہوتے ہوئے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہم مومن نہیں تو کیا غلط ہے؟

لیکن مجھے اس منطق کی ضرورت نہیں۔ تم نے شاید مومن اور مسلم میں کبھی فرق نہ کیا ہو گا۔ لو مجھ سے سن لو۔ کہ ایک مومن اور مسلم میں قرآن نے کیا فرق کیا ہے۔ ایک امر کو خدا کی طرف سے قبول کر لینا مثلاً قرآن یا رسالت پر ایمان ایک شخص کو مسلمان بنا دیتا ہے لیکن اس امر کو جب ایک شخص عمل میں لاتا ہے۔ تو وہ شخص مومن کہلانے کے قابل ہوتا ہے۔ ہم قرآن مجید کو خدا کی طرف سے آیا ہوا مان کر مسلمان تو ہو سکتے ہیں لیکن مومن ہم اسی وقت ہونگے۔ جب قرآن پر ہم عمل پیرا ہونگے۔ تم لاکھ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہو۔ تم اس کلمۂ طیبہ کے دہرانے سے مسلمان تو ضرور ہو جاتے ہو لیکن خدا اور رسول پر تمہارا کوئی ایمان نہیں۔ کیونکہ نہ خدا کی کتاب پر تمہارا عمل ہے نہ رسول صلعم کی وصایا کی تمہیں پروا ہے۔ الغرض مومن بننا عمل کو چاہتا ہے جو ہم میں آج مفقود ہے۔ اب خدا کے لئے قرآن کو کھولو۔ شروع سے آخر تک پڑھ جاؤ۔ تم نصرت فتحمندی عزت ثروت۔ حکومت۔ دولت۔ الغرض دنیا و عقبیٰ میں فلاح کا وعدہ قرآن کریم کے الفاظ میں مومن کے ساتھ ہی مختص پاؤ گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ سب کی سب باتیں آج ہم سے من حیث القوم مفقود ہیں یہ غیر مسلموں کے گھر میں ہیں۔ تو کیا قرآن کو سامنے رکھ کر اگر ہیں اس نتیجہ پر آجاؤں تو غلط نہ ہو گا۔ کہ ہم سے ایمان جاتا رہا۔ اور ایمان کا وہ حصہ جس کے ہونے پر کسی قوم میں اعلیٰ تہذیب و تمدن اس دنیا

میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ غیر مسلموں کے گھر میں چلا گیا ہم مسلم مومن نہ رہے غیر مسلم مومن ہو گئے مصیبت تو یہ ہے کہ تم ایمان و عمل کی حقیقت سے ہی نا آشنا ہو۔ تم نے ایمان کو مسلمان کی جائداد غیر مشترکہ سمجھ رکھا ہے۔ اسی غلطی نے تمہیں تباہ کیا۔ حتّےٰ کہ تم میں سے بعض نادان یہ سمجھے ہوئے ہیں۔ کہ عقیدہ ہی ہمارے لئے کافی ہے۔ چونکہ غیر مسلم کے عقائد صحیح نہیں۔ اسلئے اس کے عمل بھی اکارت جاتے ہیں۔ بعض نے تو یہاں تک اس معاملہ میں غلو کیا ہے۔ کہ اُن کے نزدیک ایک مسلمان باعمل بھی فلاح نہیں پا سکتا۔ جب تک کہ وہ کسی خاص مُقدّس انسان کے دعوے کو قبوُل نہ کرے۔ یہہ تو وہی عیسائیوں کا عقیدہ ہے جنہوں نے کسی انسان کی ذات پر ایمان لانے کو ذریعۂ نجات سمجھ کر عمل سے سُبکدوشی حاصل کر لی ؂

ایمان کیا ہے؟ ان چند صداقتوں کو یا چند صحیح اصُولوں کو قبول کر لینا جو دستور العمل زندگی کے طور پر خدا کی طرف سے وضع ہو کر انسان کو ملے۔ اور ان پر عمل پیرا ہونا۔ یہ اصول اور صداقتیں چند اور صداقتوں کے ماننے سے تعلق رکھتی ہیں جن کو اصطلاح شرعی میں عقاید کہتے ہیں۔ اِس ہی لئے صحت عقاید سے صحت عمل وابستہ ہے لیکن اس کا عکس درست نہیں

یعنی یہ ضروری نہیں کہ ایک صحیح عقائد والے کے سارے اعمال صحیح ہوں مثال کے طور پر قرآن میں چند اصول تعلیم کئے گئے ہیں جن پر چلنے سے فلاح دارین حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کریم کا خدا کی طرف سے آنا ایک عقیدہ ہے۔ جس عقیدہ کے ہونے سے قوتِ عمل مضبوط ہو جاتی ہے۔ لیکن فلاح قطعاً اُن اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہو گی۔ یعنے عمل براصول اور فلاح لازم و ملزوم ہیں۔ اور اُنمیں سبب اور نتیجہ کا اٹل رشتہ ہے ایک شخص قرآن کو خدا کی طرف سے نہیں مانتا۔ یہ ایک بدعقیدگی ہے لیکن وہ قرآن میں سے بعض اصول تمدن و تہذیب لیکر اُنہیں اپنا دستور العمل بنالیتا ہے۔ وہ لازماً اس حصۂ فلاح کو پالیگا۔ جو ان اصول مختصہ سے وابستہ تھے۔ دوسری طرف ایک شخص قرآنی تعلیمات کو من جانب اللہ سمجھتا ہے۔ اسمیں صحت عقائد پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن اس کے اصول زندگی قرآن کے خلاف ہیں۔ اس نے قرآن کو مطالعہ کرنا اور اسمیں سے اپنی زندگی کے لئے ہدایت کو تلاش کرنا جیسا کہ آج اکثر مسلمانوں کا حال ہے اپنے پر عملاً حرام کر رکھا ہے۔ اسکی صحت اعتقاد نہ اسمیں صحیح ایمان پیدا کرےگی نہ وہ کبھی فلاح کا مُنہ دیکھیگا۔ اسکی مثال عالمِ جسمانیات میں ہمیں روز ملتی ہے۔ ہزاروں لوگ

ہندوستان میں اِس وقت بھی مغربی معالجہ کے دشمن بالمقابل ایسے بھی ہیں جن کا اس علاج پر ایمان ہے۔ اگر اول الذکر گروہ میں کا کوئی فرد شدت بخار میں کونین کھالے اور آخر الذکر میں کا کوئی انسان کونین کو ہاتھ بھی نہ لگائے تو کیا طبِ مغربی پر یہ دو متضاد ایمان کونین کے عمل کو روک سکتے ہیں؟ اگر اوّل الذکر بخار سے نجات پائیگا اور ضرور نجات پائیگا۔ اور آخر الذکر بخار کی تکلیف میں دیر تک مُبتلا رہیگا۔ تو **مسلمانوں**! یاد رکھو ایک ہندو ایک یہودی۔ ایک دہریہ بھی کُلُوا وا شربوا ولا تسرفوا پر عمل کر کے دُنیا میں دولتمند بنیگا۔ اور تمہارا لا تسرفوا کے حکم پر نہ چلنا تمہیں جہنّم افلاس کی آگ میں جلائیگا جسمیں آجکل تم پڑے ہُوئے ہو۔ تمہارا یہ عقیدہ کہ یہ حکم خُدا کی طرف سے ہے تمہیں کوئی فائدہ نہ دیگا۔

یہ خیال کہ یہ تعلیم ایک انسان کی ہے اُسے نتیجہ کے رنگ میں نقصان نہ دیگا۔ قرآن کے اس اصُول کو تم من جانب اللہ سمجھتے ہو وہ ایسا نہیں سمجھتا لیکن عملاً تمہارا اس پر ایمان نہیں۔ اور وہ اس پر ایمان رکھتا ہے۔ جہانتک اس آیت کا تعلق ہے۔ تم مسلمان ہو کر غیر مومن ہو۔ وہ کافر ہو کر اس آیت کا مومن ہے۔ یہ حقیقت ہے عقاید کی۔ ایمانیات کی اور اعمال

کی مسلمان اسی فخر میں مر گئے۔ کہ اُن کے سوا باقی دُنیا صحیح عقیدہ پر نہیں۔ اسلئے کُل دنیا کے عمل اکارت ہیں۔ ہم عمل کریں نہ کریں ہماری صحت اعتقاد ہمارے لئے کافی ہے یہ نہ صرف بالبداہت ہی غلط ہے۔ بلکہ قرآن و رسول صلعم کی منشاء کے خلاف ہے۔ عقاید صرف ایک بیج یا تخم کا حق رکھتے ہیں۔ جن سے ایمان کا درخت پیدا ہوتا ہے لیکن اس درخت کی زندگی جس آبیاری کو چاہتی ہے وہ عمل ہے قرآن کی ان آیات پر غور کرو جن میں ایمان کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ عمل صالح کا ذکر کر کے جنات اور تحتہا الانہار کا ذکر کر دیتا ہے۔ اسمیں صریح اشارہ یہی ہے کہ ایمان اگر درخت ہے تو عمل اس کے لئے آبِ انہار۔ تخم خواہ کیسا ہی اچھا ہو وہ زمین میں ہی مر جائیگا۔ اور بارور نہ ہوگا۔ اگر کونپل کے نکلنے پر اسکی مناسب آبیاری نہ ہوئی۔ بالمقابل اگر ایک ناقص تخم کے درخت سے کسی صحیح تخم کے درخت کا پیوند ہو جائے اور آبیاری پاتا رہے وہ پھلدار ہو جائیگا۔ صحیح تخم کی صحبت و مجلس ایک بد تخم کو صحیح المزاج بنا دیتی ہے۔ اور ایک نیک اصل انسان صحیح اصولوں کو چھوڑ کر اصالت گنوا دیتا ہے تم کسی مذہب کے کسی پیرو کو دیکھ لو۔ وہ لاکھ قرآن کا دشمن ہو لیکن اگر کسی رنگ میں وہ مرفع الحال ہے۔ یا کسی نوعیت کی فلاح میں نے

حاصل کر لی ہے۔ تو تم اس کے اصُول زندگی قرآن سے ماخوذ شدہ
پاؤ گے۔ وہ اس امر سے واقف ہو یا نہو۔ کہ جن باتوں کو انہوں نے
دستور العمل زندگی بنا رکھا ہے وہ قرآنی ہیں انکی فلاح دُنیوی
کے لئے بہت حد تک یہ کافی ہے۔ کہ وہ قرآن کے اصُولوں
پر چل رہا ہے۔ تم دُنیوی ترقی کو اپنے اُوپر حرام مت کرو۔
من حرم زینت اللہ التی اخرج لعبادہ میں تمہیں فلاح
دُنیوی کو خدا کا ایک فضل قرار دیا گیا ہے۔ ہاں یہ اُن کے لئے
جو عباد اللہ ہیں۔ جو خدا کے احکام پر چلتے ہیں۔ اور با عمل
ہیں۔ تم لاکھ کہو کہ یہ دُنیوی چیزیں ہیں۔ ہم نے اپنے پر
انہیں حرام کر دیا ہے۔ نہیں نہیں بلکہ خدا نے تم کو اُن سے
محروم کیا ہے۔ کیونکہ تم بے عمل ہو۔ میں عنقریب اپنی کتاب

تہذیب و تمدنِ قرآن

میں یہ دکھلاؤنگا۔ کہ یوروپین تہذیب اور تمدن کا بہترین
اور قابلِ رشک حصہ اُن اصُولہائے حق کو تسلیم کرنے اور اُن پر
عمل کرنے سے پیدا ہوا ہے جو اوّلاً دُنیا میں قرآن نے تعلیم
کئے۔ وہ قرآن سے ناواقف ہوں۔ وہ اپنی ناواقفی سے قرآن
کے دشمن ہوں۔ لیکن وہ بعض صداقتہائے قرآن پر عملاً ایمان
رکھتے ہیں۔ اس سے وہ تہذیب و تمدّن کے مالک ہو گئے ہیں
کس قدر رنج کا مقام ہے۔ کہ پلیٹ فارم پر جا کر اور گلا

پھاڑ پھاڑ کر تم یہ ثابت کیا کرتے ہو۔ کہ یورپ کی تہذیب و تمدّن اِسلام کی خوشہ چینی ہے۔ یوروپین علوم کے پہلے دریافت کرنیوالے مسلمان تھے۔ اِس آباء پرستی سے تمہیں کیا فائدہ؟ جس بات کو تم نہیں دیکھتے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن دُنیا میں چند اصول لایا۔ اس نے چند صداقتیں تعلیم کیں اس سے اِنسانی دِل و دماغ میں تموّج پیدا ہؤا۔ جس نے اِنسانی دائرہ عمل و حرکت میں کائنات کے بہت سے حصّہ کو شامل کرکے انسانی کمال و اکتساب کو بڑھا دیا۔ اس سے صحیفۂ فطرت کے بعض رازِ مضمرہ منکشف ہوئے۔ اسی دریافت کا نام علوم جدیدہ ہے۔ چند صدیوں تک یہ قرآنی صداقتیں ہماری مشعل راہ ہوئیں۔ ہم نے ان پر عمل کیا۔ تاریخ عالم کے قلیل سے قلیل عرصہ میں ہم فلاح اور اعلےٰ تمدّن کے مالک ہوگئے۔ لیکن کثرت مال و مملکت نے ہمیں تعیشات میں ڈال دیا۔ ہم نے ان صداقتوں کو ہاتھ سے دیدیا۔ اس کا لازمی نتیجہ آہستہ آہستہ وہی ہوا اور وہی ہونا تھا جسمیں ہم آج گرفتار ہیں۔ ان قرآنی صداقتوں پر اہل مغرب چلنے لگے۔ انہوں نے اس زندگی کو قطعاً چھوڑ دیا جس کی تعلیم مسیح نے خُطبہ کوہ میں اور ایسے ہی اور مواقع پر کی تھی۔ کیونکہ وہ انہیں فقر و فاقہ کی طرف لیجارہی تھی تعلیم مسیح کی جگہ انہیں کسی طرح وہ صداقتیں ملگئیں جنہیں سب سے

اول دُنیا میں قرآن لایا تھا جس سے وہ اس خیر کے مالک ہو گئے جو مسلم کے ورثہ میں خلا نے دے رکھی تھی۔ جیسے کہ انشاء اللہ العزیز ہم کتاب محولہ بالا میں دکھلائینگے۔ بالمقابل یہ کسی کا کہنا کہ جن لوگوں نے اہل مغرب کو ان صداقتوں پر چلایا ہے انھوں نے تو قرآن کی شکل تک بھی نہیں دیکھی۔ نہ وہ اسلامی تعلیم سے واقف ہیں۔ یہ اعتراض وہی کر سکتے ہیں جو تمدن کی ارتقائی منازل سے ناواقف ہیں اُنہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ نامعلوم سے نامعلوم طریقوں پر ایک جگہ کی دریافت شدہ صداقت دُور دراز ملک میں جا کر دستُور العمل بن جایا کرتی ہے۔ ماہران تاریخ تمدن کی تشفی کے لئے ہم پر اسیقدر ثابت کر دینا فرض ہے کہ تمدن کا فلاں حصّہ جن صداقتوں سے وابستہ ہے۔ انہیں سب سے اوّل دُنیا میں قرآن لایا۔ اسلئے تہذیب و تمدّن کا وہ حصّہ قرآن کی برکات میں شامل ہے۔ اس امر کے ثابت ہو جانے پر وہ سر تسلیم خم کر لیتے ہیں ✦

اس مقام پر میں چند الفاظ اس وہم کے ازالہ میں بھی لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں جو ایک طرف مسلمانوں کے دلوں میں اس مایوسی کے وقت اُٹھ رہا ہے۔ اور دوسری طرف دشمنانِ اسلام کے لبوں پر طعنہ کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اسلام و قرآن ہی ماخذ ترقی و تہذیب ہے۔ تو مسلمان کیوں

آج شکار ادبار ہیں۔ اور شاہین اقبال کیوں اُن کے دشمنوں کے ہاتھ پر اُڑ رہا ہے۔ اس کا جواب تو در اصل میں نے اُوپر لکھ دیا ہے۔ لیکن یہاں بھی برعایتِ اختصار اس قدر لکھ دینا کافی ہوگا۔ کہ اسلام یا قرآن جن صداقتوں کو لایا وہ کسی قوم یا ملک سے مختص نہ تھیں وہ نسل انسانی کے لئے آئیں۔ مذاہب سابقہ مکان و زمان سے وابستہ تھے۔ قرآن سب کے لئے آیا۔ جیسے کہ وہ خود کہتا ہے۔ ذکری للعالمین جو اس پر چلیگا فائدہ اُٹھائیگا۔ اس کا دسترخوان صلائے عام دیتا ہے۔ جو آئے کھائے اور فائدہ اُٹھائے۔ ایک قوم جو دُنیا میں آج مسلمان کے نام سے مشہور ہے چند صدی پیشتر قرآن کی ہدایات پر چلی۔ جس سے وہ ترقی و اقبال کی مالک ہوگئی۔ اب انہوں نے قرآن پس پشت کر دیا۔ ان کے مقابل ایک اور قوم قرآنی صداقتوں پر چلنے لگی۔ اسلئے نام کے مسلمان تباہ کر دیئے گئے اور جو بظاہر تو دشمن اسلام تھے لیکن عملاً غلام قرآن تھے۔ وہ ان نئے عملوں پر نتیجتہً مسلط کئے گئے۔ تیرہ صد برس ہو جب اتیٰ امر اللہ فلا تستعجلوہ (خدا کی سلطنت آگئی جلدی نہ کرو) نے آسمانی بادشاہت کے آنے کا اعلان کیا۔ جس کے لئے مسیح نے دُعا کی تھی۔ اور جسکو آج بھی عیسائی دُہراتے ہیں۔ اس کا چارٹر قرآن کی شکل میں نسل انسانی

کے ایک حصّہ کو دیا گیا۔ وہ اس کی ہدایات پر چلے اور دُنیا کے مالک ہو گئے۔ اُن کی اولاد نے یہ سمجھ لیا۔ کہ یہ مملکتِ خداوندی اب ان کے ورثہ میں آگئی۔ اور ابدالآباد تک اُن کے ہاں رہیگی۔ اُنہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے تھا۔ کہ الٰہی چارٹر میں اس قسم کی وراثت کی عزّت نہیں ہوتی۔ وہاں ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کا حکم ہے۔ وہ خداوندی چارٹر کسی کے حقِ ورثہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ عمل کو چاہتا ہے۔ اگر وراثت کا ہی اصول صحیح ہوتا تو عرب کے ننگے دنیا کے مالک نہ ہوتے۔ اس چارٹر کے بیان کردہ بعض اصول جہانبانی عیسائی قوموں نے لیلئے۔ اسلئے وہ سلطنت ان کی طرف منتقل ہوگئی۔ سو اصل بات یہ ہے کہ اسلام یا قرآن فلاح کے چند اصول بتاتا ہے۔ اُن پر کوئی چلے فلاح حاصل کرلے۔ آج اگر اسلامی سلطنتیں تباہ ہوگئیں یا اسلامی شوکت مرمٹی تو اس سے اسلام پر حرف نہیں آسکتا۔ اگر ترک مرمٹے تو اسلام نہیں مرمٹتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جنہوں نے ان نام نہاد مسلمانوں کو تباہ کیا۔ اُن کا عمل صداقتہائے قرآن پر ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو یہ قرآن کی فتح ہے مسلمانوں کو اسلئے شکست ہوئی کہ ان کا عمل قرآن پر سے جاتا رہا۔ دشمنانِ اسلام کو اسلئے فتح ہوئی۔ کہ انہوں نے بعض حصص قرآن کو اپنا

ہادی بنایا افسوس صد افسوس۔ قرآن اور اسلام کو تو فتح ہو لیکن ہو اُن کے ہاتھ پر جو دشمنِ اسلام ہیں۔ اور مارے وہ جائیں جو مدعی اسلام ہیں +

اس وقت ہماری مایوسی کی کوئی انتہا نہیں۔ دنیا سمجھتی ہے ہے کہ ہم کھیل ہار چکے ہیں دشمن اپنے زعم میں ہمیں مٹا چکے ہیں۔ من حیث القوم ہماری معدوم ہونیکی گھڑیاں گنی جا چکی ہیں ہمارے ایک حصۂ قوم کے نام ونشان تک مٹانے کے سامان فلسطین۔ سیریا سمرنا۔ آرمینیا میں ایک اور طریق پر اسطرح ہو رہے ہیں۔ جس طرح موروں کے خلاف اندلس میں ہوا۔ ہاں حیرت کا مقام ہے تو یہ ہے۔ کہ وہ زمانہ ایام وسطیٰ کا تھا جب یورپ اپنی جہالت میں کُل دُنیا سے بڑھا ہوا تھا۔ آج اُسے علم وفضل کا ادّعاء ہے۔ اور حقوقِ انسانیت کی حفاظت کا دعویٰ ہے۔ بلکہ یہ جنگ بھی کہا جاتا ہے کہ چھوٹی قوموں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہوا تھا۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ جنگ کی بناء کمرشیلزم تھی اگر اس کا نصب العین چھوٹی قوموں کا قیام وحفاظت ہوتا تو ترکوں کو معدوم نہ کیا جاتا۔ زیکوسلاوز اور بلغار جیسے مجاہیل اور دُشمنانِ تہذیب وتمدّن کو تو قائم رکھا جائے اور ترکوں کو مٹایا جائے۔ کیا یہ لوگ جرمن کے ساتھ

نہ تھے؟ پھر ترکوں کے ساتھ کیوں وہ معاملہ نہ ہوا جو اُن کے ساتھ ہوا؟ محمد علی بھی وفدِ خلافت لے کر انگلستان ہو آئے لیکن ہم تو کسی کی جان کو پہلے ہی رو چکے تھے ایک انسان پہلے ہی سمجھ سکتا تھا کہ یہی ہو گا۔ ہاں اتمامِ حجت شرط تھی ہو گیا۔ جنگ سے پہلے یورپ عیاش تھا۔ اسکی تعیشات دنیا کی مال و دولت چاہتی تھی۔ وہ اپنا بوجھ دوسری قوموں پر ڈالنا چاہتا تھا بس اسی مال و دولت اور اسی بوجھ کی تقسیم نے یوروپین اقوام میں جنگ چھڑوائی +

لیکن اس ہجو یا اس مرثیہ گوئی سے کیا فائدہ؟ اُسے چھوڑنا ہی بہتر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا جو فتویٰ معدومیت آج غیر مسلموں نے ہم پر صادر کر دیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ تاریخِ عالم تو اسی فتوے پر مُہر لگاتی ہے لیکن قرآن ہمیں بڑی زبردست بشارت دیتا ہے۔ ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون۔ نہ تم ذلیل ہو سکتے ہو۔ نہ تم اسیرِ حُزن بن سکتے ہو۔ تم ہی غالب ہو گے ان کنتم مومنین۔ اگر مومن بن جاؤ۔ قرآن پر ایمان رکھنے والے کیلئے ایک مژدہ ہے۔ یہ ایک بشارت عظمیٰ اور انجیل ہے لیکن یہ انجیل **انجیل عمل** ہے۔ آج ہم باعمل قوم بن جائیں۔ آج ہم غفلت کو چھوڑ دیں۔ آج ہم اپنے وقت۔ اپنی قوتوں۔ اور اپنی گئی گذری دولت کو جو کچھ بھی ہے صحیح طور پر استعمال کریں

تو آج ہی ۔ دولت ۔ ثروت ۔ شوکت ۔ تمکنت ۔ سایہ کی طرح ہمارے پیچھے ہولیگی ۔ قرآن کریم نے جہاں باریتعالیٰ کی اِن صفات کا ذکر کیا ہے جو دُنیا کو اسلام سے پہلے بھی معلوم تھیں وہاں کتاب حمید نے باریتعالیٰ کے ایک خاص خُلق کا اظہار فرمایا ہے ۔ جس سے دُنیا پہلے نا آشنا تھی ۔ دُنیا خدا کو رحیم مانتی تھی ۔ لیکن وہ یہ نہ جانتی تھی کہ اس کے رحم کی ایک اور شکل کا نام رحمانیت ہے ۔ جو ایک عمل کرنے پر مستعد انسان کو کُل مواد ضروریہ عطا کر دیتا ہے کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہو ۔ وہ ہر طرح بے سروسامان ہو لیکن اگر ہاتھ پاؤں ہلانے پر کھڑا ہو جائے ۔ تو ضروری سرمایہ خدائے رحمٰن اپنی طرف سے دیا کرتا ہے ۔ قرآن نے خدا کو رحمٰن بتلا کر قوائے انسانی میں ایک نیا ہیجان پیدا کیا ۔ اور اس صفت کو صفت رحیمیت کے ساتھ ملا کر دنیا کے آگے ایک نیا فلسفۂ زندگی پیش کیا ۔ جس نے صرف قوت عمل کو انسان کا اصلی سرمایہ قرار دیا ۔ اور اسے بتلایا ۔ کہ اُٹھ اور ان خداداد قوتوں کو اور خداداد اسباب کو جو اُور کی طرح تیرے قبضہ میں بھی ہیں استعمال کر ۔ پھر جو تیرے اردگرد ہے وہ سب تیرا ہی تیرا ہے ؛

عیسائی تھیالوجی بھی اِسی طرح ربانی رحم کے ایک نئے انکشاف کی مُدعی ہے ۔ رحمانیت تو خدا کے نزدیک بدل رحم کا نام ہے ۔ لیکن عیسائیوں کے نزدیک خدا کا رحم بلا بدل ظاہر نہیں ہو سکتا ۔

خصوصاً جب عدل کا تقاضا دوسری طرف ہو۔ ایسے وقت میں خدا کی محبّت اپنی طرف سے بدل دیکر تقاضۂ عدل کو پورا کر دیتی ہے اور اس طرح رحم خداوندی کا ظہور ہوتا ہے۔ اس انوکھے اخلاق ربّانی کا انکشاف مسیح پر تو ہؤا نہیں۔ نہ اعمال حواریین میں اس کا کہیں پتہ چلتا ہے۔ ہاں اس خیال کا کچھ دُھندلا سا نقشہ اس نیم فلسفی اور نیم ربّی پولوس کی تحریریں میں ضرور ہے جو موجودہ عیسائیت کا دراصل بانی ہے۔ اِس نئی صفتِ الٰہیہ کو کہ اُس کا رحم بلا بدل نہیں ہوتا۔ دراصل مسئلۂ کفارہ کی جوازیّت کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ آدم نے گناہ کیا اس کے عوض میں وہ اور اُس کے بیٹے تک پکڑے گئے۔ عدل خداوندی معاوضہ یعنی سزا کو چاہتا تھا۔ رحم الٰہی انسان کو چھڑانا تو چاہتا تھا لیکن رحم کا اظہار عدل کے مقابل بلا بدل ہو نہیں سکتا تھا۔ محبّت خداوندی اس پر جوش میں آئی۔ خدا تعالیٰ نے تقاضائے محبت اپنی طرف سے بدل دیدیا۔ ابن اللہ سزا بھگتنے کے لئے آیا۔ ایک بیگناہ گناہگاروں کے عوض میں مصلوب ہؤا۔ اس طرح تقاضائے عدل پورا ہو گیا۔ اور اس طرح انسان اور بگڑے ہوئے خدا میں مصالحت ہو گئی۔

حیرت ہوتی ہے کہ کوئی اسے کس طرح علم الٰہیات میں شامل کرے۔ یہ تو ایک طوطا کہانی ہے۔ واللہ ربّ رحیم کیا اور رحم کا عوض کیا۔ ان کو یہ

بھی سمجھ نہیں آتی کہ رحم کے اظہار میں بدل کیا۔ یہ ضرور ہے کہ کسی کی محنت کے عوض ایک کا بدل کوئی سو دیدے۔ وہ رحم ضرور ہے لیکن گناہ کا عوضہ لے کر معافی بخشنا رحم نہیں کہلاتا۔ پھر اس کا نام معافی بھی کیوں رکھا جائے۔ گناہ کی معافی کے لئے تو یہ نہیں کہ گنہگار کو کوئی سزا دیجائے۔ اس کا نام رحم ہے جرمانہ گنہگار دے یا اس کی جگہ کوئی اور دے جرمانہ کرنیوالے نے کوئی رحم نہیں دکھلایا۔ ہاں یہ ایک عدل کا فعل ہے۔ اور اسمیں عادل کی کوئی خوبی نہیں۔ پھر انہیں یہ سمجھ نہیں۔ کہ عدل کا اظہار حاکم کی طرف سے دو متخاصمین میں ہوا کرتا ہے جہاں ایک نے دوسرے کا کوئی گناہ کیا ہو لیکن جہاں گنہگار ہیں اور اس ذات میں معاملہ ہو جس کے خلاف گناہ ہوا ہو تو گنہگار کو سزا دینا عدل نہیں کہلاتا۔ بلکہ انتقام کہلاتا ہے۔ اس مسئلہ کو مصنف اوراق ہذا نے اپنی کتاب (A word on the attributes of God)

(صفات الٰہیہ پر دو باتیں) میں بالتفصیل لکھا ہے۔ یہاں ہمیں اسی قدر دکھلانا مقصود ہے۔ کہ یہ کوئی نیا انکشاف حقیقت نہیں۔ یہ وہی پرانا مسئلہ کفارہ ہے۔ اس پر یہ پہلو ایزاد کر دینا۔ کہ خدا نے انسان سے اپنا قرضہ وصول کرنے میں رقم قرضہ اپنی جیب سے دیدی کیسی خوش فہمی کا

ثبوت نہیں - اگر صفاتِ الٓہیہ ہی اِنسانی اخلاق کے لئے اُسوہ بنا کرتے ہیں - تو پھر اس نئے خُلق ربّانی سے اِنسان کو فائدہ نہیں ہوا - اس نے مُروّت اور احسان جیسے اخلاق فاضلہ کو ذبح کر دیا - ان کا اظہار اسی وقت ہو سکتا ہے - جب انسان نیکی کرنے میں بدل کا خواہاں نہو - چنانچہ مغربی اقوام میں جہاں بدل پر زور دیا جاتا ہے - وہ بلا عوضہ نیکی کرنا بہت کم جانتے ہیں - ان کے کل معاملات (give and take) پر چلتے ہیں - یعنی جسقدر دوگے اسی قدر لوگے جن کا خُدا ایسا ہو - اس کے پرستاروں میں بلا بدل نیکی اگر کم ہو جائے اور وہ آہستہ آہستہ ذاتی اغراض کے غلام ہو جائیں - اور اُن کا ہر ایک معاملہ ذاتی غرض اور نفسانی فائدہ سے وابستہ ہو جائے تو کیا تعجب ہے +

رحمِ خداوندی کا وہ عظیم الشان انکشاف جس نے اِنسانی قوے اور اس کی قوت عمل پر ایک عجیب و غریب اثر کر کے قرونِ اولے کے مسلمانوں کے ذریعہ تمدّن دُنیا کو یکلخت بدل دیا وہ صفت رحمٰن سے تعلق رکھتا ہے - رحمانیّت اور رحیمیّت لفظ رحم سے مشتق ہیں - انسان اور ایسے ہی دوسری مخلوقات کو صدہا قسم کی ضروریات لاحق ہیں - جن ضروریات کے

دفعیہ پر ان کی ہستی اور ان کی بہبودی اثر رکھتی ہے لیکن ان کی ضروریات کے دفعیہ کے اسباب کا پیدا کرنا ان کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے بلکہ ہماری بعض ضرورتیں تو ایسی ہیں۔ کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اسباب دفعیہ موجود نہ ہوں تو ہماری زیست محال ہو جاتی ہے۔ ایک بچے کے پیدا ہونے سے پہلے ماں کی چھاتیوں میں دودھ ہونا چاہیئے۔ اسکی زندگی کے لئے اس کی پیدائش سے پہلے ہوا۔ پانی۔ زمین آسمان اور مافیہا کا وجود ہونا چاہیئے جس رحم خداوندی نے ان سب نعماء کو پیدا کیا۔ اور وہ ہمارے کسی عمل کے عوض میں نہ تھا۔ اس رحم کا نام فرقان حمید نے رحمانیت رکھا ہے۔ ان ضروریات زندگی کو چھوڑ بھی دیا جائے تو ہماری ہر نقل و حرکت ہمارا ہر عمل و فعل ایک مواد کو چاہتا ہے۔ ایک نجار اور لوہار کی سب کوششیں لکڑی لوہے۔ آگ کے بغیر بیکار ہیں۔ اسی طرح حرفت و صنعت بلکہ ہر صورت معاش انسانی کی ہر ایک شاخ کسی نہ کسی مواد کو چاہتی ہے جس کا وجود پہلے سے موجود ہونا چاہئے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ وہ مواد اپنی ابتدائی شکل میں انسان کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ خود ہمارے ہاتھ پاؤں۔ دل و دماغ۔ جن کے کرشموں کا نام انسانی

صنعت ہے۔ یہ سب کے سب بلا بدل عطیہ خداوندی ہے۔ یہ فضل بلا بدل خداتعالیٰ کی طرف سے سب کے لئے یکساں ہوا۔ اسکی تقسیم میں مذہب وملت رنگ اور قوم کی تمیز رب العالمین نے نہیں رکھی۔ ہاں وہ فضل جو انسان کی محنت پر بطور ثمرات خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اور وہ ایک کا عوض ایک نہیں بلکہ دس یا سو گنا یا اس سے بھی زیادہ دیتا ہے۔ وہ صفت رحیمیت سے وابستہ ہے۔ یہ جو آثار میں آیا ہے۔ کہ خدا کی صفت رحمانیت مومن کافر سب کو یکساں فیض رسانی کرتی ہے۔ مگر اسکی صفت رحیمیّت کا ظہور صرف مومن کی ہی ذات پر ہوتا ہے۔ یہ ایک عظیم الشان صداقت تھی۔ مگر بدقسمت مسلمانوں نے اس کی حقیقت کو نہ سمجھا۔ اور اس کے غلط مفہوم نے انہیں اور تباہ کیا۔ اُنھوں نے یہ سمجھ لیا۔ کہ خدا ہمارا ساجھی ہے۔ چند دن دُنیا میں کافر مزے کریں۔ آخر تو ہم ہی ہونگے۔ رحمانیت اپنے کرشمے اس دنیا میں دکھالے۔ قیامت میں رحیمیّت ان کافروں کو دھکّا دیگی۔ بات تو صحیح ہے لیکن رحیمیّت تو مومن یعنی صاحب عمل کے لئے ہے۔ اور تم کہاں کے مومن آگئے یاد رکھو

ومن کان فی ھٰذہٖ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ واضل سبیلا۔

اصل حقیقت اس نئے انکشاف کی تو یہ تھی۔ کہ انسان بے سروسامانی سے نہ گھبرائے۔ وہ میدان عمل میں اگر آنا چاہے

تو بے مائیگی اُسے تکلیف نہ دے۔ اسی وجہ سے خدا کی کتاب اور اسکی ہر ایک سُورۃ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کی گئی جسمیں اللہ کی دو صفات رحمٰن و رحیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ اسی وجہ سے ہمیں حکم ہوُا کہ ہم ہر ایک کام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کریں۔ انسان سمجھے کہ اُسے جو کچھ بھی ضرورت لاحق ہے۔ اس کے دفعیہ کے اسباب رحمٰن نے پیدا کر رکھے ہیں۔ ہاں وہ اسباب اُسی وقت اس کے مفید ہو سکتے ہیں۔ جب وہ خود حرکت کرے۔ مثلاً ہماری زندگی کے لئے کسی قسم کے غلہ یا جنس کی ضرورت ہے۔ جس کی پیدائش کے لئے ہمیں کائنات کے ذرّہ ذرّہ کی امداد کی ضرورت ہے۔ زمین۔ آسمان۔ ہوا۔ پانی۔ سُورج۔ چاند۔ ستارے بادل۔ مختلف قسم کی گیسیں۔ الغرض کائنات کا ہر ایک عنصر جب تک ہمیں خدمت نہ دے۔ کسی غلہ کا ایک دانہ بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ سب کے سب خادم ہمیں رحمٰن نے بلا مزد تو عطا کر رکھے ہیں۔ مگر یہ خدمت اُسی وقت کرتے ہیں۔ جس وقت انسان کی طرف سے پہلے کوئی حرکت ہوتی ہے۔ جس وقت انسان نے ارادہ کرکے مناسب وقت پر کھیت کو درست کیا اور تخم ریزی کر دی۔ تو پھر یہ سب کے سب بے مزد خادم یعنی عنصر کائنات اپنی اپنی خدمات مفوضہ شروع کر دیتے ہیں۔ اس ربانی کل کی نقل و حرکت کے لئے پہلا عمل انسان کی طرف

ہونا چاہئے۔ حدیث میں جو یہ آیا ہے۔ کہ خدا اس شخص کیطرف دس قدم چلتا ہے۔ جو اسکی طرف پہلے ایک قدم رکھتا ہے۔ اس سے بھی یہی مراد ہے یعنے تمہارے حرکت کرنیسے خدا کے افضال حرکت میں آجاتے ہیں۔ اُن افضال کو مشخصہ شکل دینے کے لئے جس مواد کی ضرورت تھی اُسے پیدا کرنیکی تمہیں تکلیف نہیں دیگئی۔ وہ رحمٰن نے کافر مومن کے لئے برابر پیدا کر رکھا ہے۔ ہاں مومن سے مراد یہاں وہی انسان ہے جو اس مواد پر عمل کرتا ہے +

یہ جو کہا گیا ہے کہ رحمٰن نے اپنے فضل سب کیلئے برابر کر دیئے لیکن اِن فضلوں کا صحیح طور پر مفید ہونا صاحب عمل کیلئے رکھا ہے۔ اِنسان کے لئے یہ ایک بڑی بھاری خوشخبری ہے یہ وہ بشارت ہے جو انجیل عمل کی روح رواں ہے۔ اِنسان کو کسی کام کرنے سے پہلے دو باتوں کا یقین ہونا چاہئے۔ جسکے سوا اس سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ دو باتیں یہ ہیں۔ ایا مواد ضروریہ اسکے قبضہ میں ہے جس پر اسکی محنت خرچ ہو گی۔ ثانیاً یہ کہ اسکی محنت تو ضائع نہ ہو گی۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تلاوت ہمیں یقین دلاتی ہے کہ مواد ضروریہ ہماری ضرورت کے پیدا ہونیسے پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے۔ اور ہماری محنت کا ضائع ہونا تو درکنار ہمارے ہر ایک کام کا عوضہ ہمیں حسب مشیت ایزدی دس سو۔ یا

ہزار گُنا تک ملیگا - کیونکہ ہمارا خدا رحمٰن اور رحیم ہے کسقدر حوصلہ افزا یہ تعلیم ہے - صرف یہ خیال کہ جو مَیں چاہوں اُس کے پیدا کرنے کے سامان دنیا میں موجود ہیں - اور میری محنت کبھی ضائع نہ جائیگی - اگر میں اُن سامانوں کو استعمال کروں - یہ کسقدر جرات دلانیوالی بات ہے اس سے تو ایک مُردہ بھی زندہ ہو جاتا ہے - ایک نامرد مرد اور ایک اپاہج کارکن ہو جاتا ہے +

اگر نظرِ تعمق سے اِس حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ نیا عرفان جو قرآن لایا وہ ہر قسم کی ترقی - ہر قسم کے علوم کی دریافت کا موجب ہو جاتا ہے - جو کچھ بھی ضرورت میرے سامنے ہو - جس قسم کی جائز خواہش میرے تعقّل و تصوّر میں آئے میں ہوا میں اُڑنا چاہوں یا پانی کی تہ میں سفر کرنا چاہوں - مَیں ہزار ہا کوس پر بیٹھ کر بات کرنی چاہوں الغرض آسائش آرام - راحت - آسانی کی جو بھی شکل میرے ذہن میں آئے - اس کے پیدا ہو جانے کے سامان دُنیا میں ضرور موجُود ہیں - اور جس وقت میں ان سامانوں کو جمع کرونگا - میری مطلوبہ باتیں فی الفور پیدا ہو جائیں گی - ہاں مجھے ان اسباب کا دریافت کرنا ہے وہ زمین میں ہیں یا ہوا میں - وہ پہاڑوں کی کھوہ میں ہوں

یا ستاروں میں وہ میرے ہاتھ میں آگئی ہیں - اور اُن کو ہاتھ میں لانے کے لیئے جب میں قدم اُٹھاؤنگا تو وعلم آدم الاسماء کلھا کہنے والا دس قدم میری طرف آئیگا اُن اسباب کو میں دریافت کرلونگا - اسی دریافت کا نام سائنس یا علوم جدیدہ ہے - دیکھو یہ باتیں میں نہیں کہتا خود قرآن بھی کہتا ہے - ذرا اس خوشخبری پر غور کرو - واتکم من کل ماسالتموہ (جو بھی تم مانگو خدا دیتا ہے) تم اُن باتوں کے سوا جنکے خلاف کوئی نص صریح ہو جو چاہو مانگو - جو کچھ بھی تمہارے ذہن میں آئے اُسے حاصل کرنے کا ارادہ کرو - وہ تمہیں کس طرح ملیگا - یاد رکھو کہ یہ کسی وہمی فتوحات کا نتیجہ نہیں نہ تکیہ کے نیچے سے کسی وظیفہ کے پڑھنے سے کچھ ملیگا - اِن فتوحات کی کنجی اسی آیت کا پہلا حصّہ ہے - اور اس سے پہلی آیت جس کا خلاصہ یہ ہے - کہ زمین آسمان وما فیہا ہم نے تمہارے نوکر کر دیئے ہیں - ان سے جو کام چاہو لیلو +

اِس ایمان کے ساتھ مسلمانانِ قرونِ اولے اُٹھے اور تاریخ عالم میں کا قلیل سے قلیل وقت انھوں نے علومِ مادیات کے دریافت میں خرچ کیا - قرآن نے نہ صرف رحمانیت اور رحیمیّت کی حقیقت سے اُنہیں آشنا کرکے اُن کے دائرہ عمل کو لامحدود وسعت دی - بلکہ اپنی مختلف تعلیمات میں مادی علوم

کے دریافت کی طرف متوجہ کیا۔ جن باتوں کو ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "تمدن و تہذیب قرآن" میں دکھلائیں گے۔ اسلام سے پہلے دنیا کی متمدن قومیں ذہنیات باطنیات اور نظریات کے متعلقہ علوم میں انہماک رکھتی تھیں۔ انہیں مادیات کی طرف کما حقہٗ توجہ نہ تھی۔ اسلام کے آتے ہی مختلف قسم کی سائنسیں آناً فاناً پیدا ہوگئیں اس کی وجہ صرف یہ ہی تھی۔ کہ اسلام نے فقرہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر اسقدر زور دیا۔ کہ ایک مسلمان دن میں ہزاروں دفعہ پڑھ جاتا ہے۔ حتّٰی کہ شارع اسلام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جس کام کو بسم اللہ سے شروع کروگے اسمیں ضرور برکت ہوگی۔ بات تو سچ ہے۔ اگر بسم اللہ پڑھتے ہی میں سمجھ لوں کہ جس کام کو میں کرنے لگا ہوں۔ اس کے سامان دُنیا میں ضرور موجود ہیں۔ اور وہ میرے لئے بنے ہیں۔ اور میں ان کو جمع کر کے اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہوں۔ الغرض یہ سب فضل اور یہ سب رحم خداوندی جس کی طرف رحمٰن و رحیم اشارہ کرتے ہیں۔ صرف قوت عمل کو حرکت میں لانے کے لئے تھا۔ اس نے جہاں ایک طرف ہمیں یقین دلایا۔ کہ ہمارا کوئی عمل ضائع نہ ہوگا۔ کیونکہ ایک طرف رحمٰن نے مواد ضروری پیدا کر رکھا ہے۔ اور

وہ سب کے لئے یکساں کھلا پڑا ہے۔ اور وہ ہمارے زیر عمل آ کر مثمر ہو جائیگا۔ وہاں ہمیں یہ بھی یقین دلا دیا کہ اگر تم قدم نہ اُٹھاؤگے۔ اور کوئی کام خود نہ کروگے تو تمہیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ الغرض جو کچھ ہے وہ عمل ہی عمل ہے ہماری حاجات کا کفیل ہماری آرام و آسائش کا ذمہ وار ہماری عزّت و شہرت کا ضامن اگر کوئی ہے تو عمل ہے۔ یہ سچ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے فضل خداوندی سے ہوتا ہے لیکن ان فضلوں کی جاذب اگر کوئی چیز ہے تو عمل ہے۔ دُنیا میں جہاں ہر ایک چیز اور ہر ایک عمل انسان کی بہتری کے لئے پیدا ہوا ہے اس کا ایک اور پہلو اپنے اندر بدنتائج بھی رکھتا ہے۔ یہی خیر و شر کی حقیقت ہے۔ جس کی تفصیل ہم آگے چلکر کرینگے۔ مذہب حق کا فرض ہے کہ وہ اشیاء یا اعمال کے پہلوئے شر سے دُنیا کو متنبہ کر دے۔ یا ایسی تعلیمات کرے کہ جس سے انسان اُس شر سے بچ جائے۔ قوّت عمل کے پرستار بعض وقت پرستار مادیات ہو جاتے ہیں جس سے آہستہ آہستہ ان میں دہریّت کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن کی نگاہ میں عمل ہی ان کا خدا اور عمل ہی اُن کا رزاق ہوتا ہے۔ یہ حالت آج اہل مغرب کی ہے لیکن وہ کونسا عمل ہے۔ یا کونسی صنعت و دستکاری ہے۔ جو موادِ

ضروریہ نہیں چاہتی۔ اس مواد کے بغیر تو ہمارے سب کے سب عمل بیکار ہو جائینگے۔ ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ ایک لمحہ کیلئے قوت عمل کو حرکت میں نہیں لاسکتے۔ جب تک مَوادِ ضروریہ پہلے ہی سے موجود نہ ہوں۔ اور یہہ ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں کسی ہمارے عمل کے ماتحت پیدا نہیں ہُوئیں۔ اس حقیقت کی طرف قرآن بار بار اشارہ کرتا ہے۔ وما عملتہ ایدیھم افلا یشکرون۔ اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا فھم لھا مالکون۔ مانا کہ عمل ہی ہماری راحت و آسائش کا موجب ہے۔ عمل ہی ہمارا رازق و مالک سہی۔ لیکن یہ خدا تو ایک اور خدا کے وجود کو چاہتا ہے۔ جو عمل کے لئے مواد کو پیدا کرے اسلئے ایک صحیح مزاج انسان عمل کو سجدہ نہیں کرتا بلکہ اس طاقت کے آگے جُھک جاتا ہے۔ کہ جس کے ہاتھ نے پہلے ہی سے سب ایسی چیزیں پیدا کر رکھی ہیں۔ جن پر انسانی ہاتھ نے کام کر کے ضروریات پیدا شدہ کو دفع کرنا ہے ؛

کیا ہماری ضروریات کے مطابق اشیاء میں خواص پہلے سے موجود نہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ تمہاری ضروریات کے پیدا ہونے سے پہلے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یوں کہنا چاہیئے کہ اُن کے احساس و ادراک سے بھی پہلے اشیاء میں خواص موجود تھے۔ تمہارا کام تو ضرورت پر صرف ان کی تلاش و دریافت ہے جیسے

تمہاری اصطلاح میں سائنس کہتے ہیں۔ کیا اس سے ایک بالاتر ہستی کا پتہ نہیں چلتا کہ جس نے انسان کے پیدا ہونے سے پہلے اسکی ضروریات کے دفعیہ کے اسباب پیدا کر دے۔ اسی بالاتر طاقت کا نام قرآن نے رحمٰن رکھا ہے۔ کوتاہ نظر انسان قوت عمل کے کرشمے دیکھ کر پرستار عمل ہوجاتا ہے وہ سائنس کے آگے جھکتا ہے لیکن امر حق یہ ہے۔ کہ ایک عاشق عمل سے بڑھ کر بھی کسی اور پر رحمانیت کی حقیقت منحقق نہیں ہوتی۔ میدان عمل میں وہ ہر قدم پر دیکھتا ہے۔ کہ اسکی کوشش اور اسکی سعی کا معمول اس کے عمل کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ حرکت عمل سے پہلے کسی اور کے ہاتھ نے اسے پیدا کر رکھا ہے۔ ایک صاحب بصیرت کا دل اس طاقت کے متعلق تشکر و اطمینان سے بھر جاتا ہے۔ جس نے یہ سب چیزیں پہلے ہی سے پیدا کر رکھی ہیں۔ اور اگر ذرا غور سے دیکھو تو عمل پیدا ہی نہ ہوتا۔ اگر ذرائع عمل و مورد و مصدر عمل پہلے سے موجود نہ ہوتے۔ یہ کوئی باریک استدلال نہیں۔ نہ کوئی گہری منطق ہے کہ جس سے ایک پرستار عمل پر حقیقت وحقیت رحمانیت ظاہر نہ ہوجائے۔ حق تو یہ ہے کہ جس طرح انسان ضرورت ہستی بالا کو مسئلہ عمل کے ذریعہ سمجھتا ہے۔ ویسے کسی اور صورت میں ممکن نہیں +

اسی طرح اگر ایک انسان نتائج عمل پر ہی غور کرے تو بھی ہر قدم پر جسطرح پرستار عمل خدا کو شانِ رحیمیت میں دیکھتا ہے۔ ویسے کوئی اور درود وظیفہ کرنیوالا نگر یا ہیچ انسان نہیں دیکھ سکتا۔ ایک مادیت پرست کے نزدیک ایک عمل کا بدل ایک ہی ہو سکتا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ کسطرح ایک عمل کا عوضہ دس یا زیادہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جہاں انسان کے عمل پر نتائج کے مترتب کرنے میں من کل الوجوہ انسانی ہاتھ کو ہی دخل ہو۔ وہاں ایک فعل کا نتیجہ عموماً ایک ہی ہوتا ہے لیکن جس امر کے نتیجہ مرتب کرنے میں فطری قویٰ یا فطری اشیاء کو دخل ہو وہاں ایک فعل کا نتیجہ ایک فعل کے مقابل کئی گنا ہوتا ہے۔ انسان کی مشین میں بھی کوئی غلہ ڈال کے دیکھ لو اور پھر دوسری طرف اسی غلہ کے چند دانے زمین میں ڈالدو جہاں فطری مشینیں کام کر رہی ہیں۔ نتائج خود بتلا دینگے کہ صُورت اول میں ایک کا عوض ایک اور صُورت ثانی میں ایک کا بدل سو ہے۔ اگر آپ کسی مقام پر پانی پہنچانا چاہیں اور صرف ان ذرائع سے کام لیں جنمیں من کُل الوجُوہ انسانی عمل کام کرے تو بالیقین انسانی عمل کے مقدار کے مطابق ہی بہم شدہ پانی کی مقدار ہو گی۔ جتنے سقے بہم پہنچاؤ گے اتنا ہی پانی وہاں پہنچیگا۔ لیکن تم کافی مقدار درختوں کی کہیں لگا دو۔ پھر دیکھنا کہ موسم پر بارانی سقے اس قدر پانی وہاں بہم پہنچائینگے جس کا

تم وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے۔ درخت بادلوں کو اپنی طرف کھینچ لیں گے۔ اور ایک آدھ گھنٹہ میں وہاں اس قدر پانی ہوگا۔ کہ شاید برس میں درجنوں سقے بہم نہ پہنچا سکیں۔ یہ شانِ رحیمیت ہے جسے ایک پرستارِ عمل آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ جو نتائج مرتب ہوئے۔ اس کا محرک تو اس کا عمل تھا۔ لیکن اس کے ایک عمل کا عوض کئی گنا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جہاں میدانِ عمل میں انسان سے بالاتر کوئی اور ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اس کا نام قرآن نے رحیم رکھا ہے۔ وآیۃ لھم الارض المیتۃ احییناھا واخرجنا منھا حبا فمنہ یاکلون۔ وجعلنا فیھا جنات من نخیل واعناب وفجرنا فیھا من العیون لیاکلوا من ثمرہ وما عملتہ ایدیھم افلا یشکرون۔ ترجمہ۔ مردہ زمین کو دیکھ لو ہم ہی اُسے زندہ کر دیتے ہیں۔ اسمیں غلّہ واجناس پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی میں میوہ جات اور پانی کے چشمے چلا دیتے ہیں۔ انسان ان ثمرات سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن یہ پھل کی کل باتیں اسکے ہاتھ اور عمل کا تو نتیجہ نہیں پھر کیوں یہ لوگ شکرگزار نہیں ہوتے کیا عمدہ مثال ہے جو ایک طرف قوت عمل کی عزت کرتی ہے۔ دوسری طرف ایک بندۂ عمل کی آنکھیں کھول کر دکھلاتی ہے۔ کہ تیرا رزاق تیرا عمل نہیں بلکہ وہ اسباب جن پر تیرے عمل نے کام کیا

وہ تیرے عمل سے پیدا نہیں ہوئے۔ وہ تیرے رحمٰن نے پیدا کیئے۔ پھر تیرے عمل کے بعد بھی جو ثمرات مُرتّب ہوئے۔ وہ خالی تیرا ہی عمل نہیں بلکہ شان رحیمیت نے ایک کو دس کر دکھایا ہے۔ ہاں۔ وہ شان تحرک میں تب ہی آتی ہے۔ جب تیرا ہاتھ فیض رحمانیت کو صحیح طور پر استعمال اور فیض رحیمیت کو جذب کر لیتا ہے

سوال یہ ہے۔ کہ میں ان اوراق میں عمل سے کیا مُراد لے رہا ہوں۔ بد قسمتی سے آج ہم ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ جب علم دین سے مسلم دُنیا دن بدن ناآشنا ہوتی جاتی ہے۔ آج عمل سے مُراد مذہبی اصطلاح میں چند شعار اسلام سمجھے گئے ہیں۔ وہ شخص آج باعمل سمجھا جاتا ہے جو پابند صوم وصلوٰۃ ہو۔ جو حج بھی کر آیا ہو۔ اور قرآن کی روز تلاوت کرے۔ تو سُبحان اللہ خواہ اسکے معاملات کیسے ہی گندے سے گندے کیوں نہ ہوں۔ بالمقابل ایک شخص خواہ کیسا ہی نیک مُعاملہ ہو اگر وہ صوم وصلوٰۃ سے غافل ہے تو مذہبی دائرہ میں اس سے بڑھ کر کوئی بدعمل نہیں سمجھا جاتا۔ اس سے بڑھ کر ہماری اور کیا بد قسمتی ہو سکتی ہے۔ کہ ہم نے لفظ عمل کے معنی جس کی طرف بار بار قرآن توجّہ دلاتا ہے اس قدر محدُود کر دئیے ہیں۔ آج ہمیں اسباب کی سخت ضرورت ہے۔ کہ علمائے کرام حقیقت عمل سے مسلمانوں کو آشنا کریں

وہ انہیں بتلائیں - کہ کلمۂ طیبہ کا اعتراف نماز - روزہ
حج - زکوٰۃ تو ارکان اسلام ہیں بذات خود اسلام نہیں
جس مکان کا نام اسلام ہے - اس کے یہ ستون ہیں
بیشک کوئی مکان ستونوں کے بغیر کھڑا نہیں ہوسکتا
لیکن ستونوں کا نام تو مکان نہیں ہوتا - تم کسی سفید زمین
پر ایک مخمس مکان بنانا چاہتے ہو - تمہیں پانچ ستون
کھڑے کرنے پڑیں گے لیکن وہ ستون کھڑے کرکے اگر تم
عمارت کو چھوڑ دو تو کوئی عقلمند اس تمہاری تعمیر کا نام
مکان نہیں رکھیگا نہ بطور مکان وہ ستون تمہیں کچھ فائدہ
دے سکتے ہیں - یہ ستون بھی بقیہ عمارت کی تکمیل سے ہی
محفوظ رہینگے - ورنہ حوادث زمانہ ان کو بھی گرا دینگے
وہ بقیہ عمارت تمہارے اعمال ہیں جو ہر شعبہ زندگی میں تم سے
صادر ہونے چاہئیں +

سب سے اول تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ خدائے تعالیٰ نے دنیوی
شان وشکوہ - دنیوی عزت واحتشام کسی مسلمان پر حرام نہیں
کی - من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ
نے ہمارے لئے شوکت وتمکنت دنیوی مقدر کی ہے سب سے
بڑھ کر تم یہ دیکھو کہ قرآن اور ایسا ہی وحی سابقہ کی غرض کیا ہے
اولئک علی ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون

آدم سے لیکر آنحضرت صلعم تک وحی الٰہی اُن راہوں کو دکھلانے آئی جس سے انسان فلاح یاب ہو کسی لغت عرب کو اُٹھا کر دیکھو تمہیں نظر آجائیگا۔ کہ وہ تمام خیر و برکت وہ تمام انعامات جو ایک انسان اس دنیا میں یا آخرت میں حاصل کر سکتا ہے وہ لفظ فلاح میں آجاتے ہیں۔ پھر قرآن کریم نے سلطنت۔ طاقت تجارت علم۔ جہانبانی حکمرانی۔ ان سب باتوں کو اپنے افضال میں گنا ہے۔ یہ سب باتیں فلاح کی مختلف شکلیں ہیں۔ قرآن تمہیں وہ راہیں دکھلانے آیا۔ جن سے یہ باتیں تمہارے قبضہ میں آجائیں۔ ان راہوں پر چلنے کا نام عمل ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ صرف نماز۔ روزہ۔ حج زکوٰۃ اور کلمہ طیبہ کا اقرار علیٰ وجہ التجرد یہ باتیں پیدا نہیں کر دیتا۔ ہاں ان ارکان کے نہ ہونے سے ہم میں پورے طور پر وہ طاقت عمل بھی پیدا نہیں ہوتی کہ جن سے ہم قرآن کے مندرجہ طریقہائے فلاح پر چلکر اس کے مالک ہو جائیں۔ ایسا ہی ان ارکان کو ادا کرنے کے بعد اگر ہم اپنے ہاتھ پاؤں باندھ رکھیں تو گویا صراط عمل کے سر پر ہم کھڑے ہو گئے ہیں۔ اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا۔ بیشک ہم ان ارکان اسلام کی ادائگی کے بغیر مسلمان نہیں رہ سکتے لیکن اگر ہمارا عمل ان ارکان کی ادائگی تک ہی محدود ہے۔ تو پھر ہم پورے مومن بھی نہیں بن سکتے۔ مومن وہی ہے

جو دینی و دنیوی معاملات کے حصول میں کسی رنگ میں غافل نہ ہو۔ روزی کمانا۔ اپنے بچوں کی پرورش کرنا۔ صحت معاملہ کو قائم رکھنا۔ امانت و دیانت کی راہ اختیار کرنا حقوق خلق اللہ کی نگہداشت۔ اکتساب اخلاق فاضلہ۔ معاونت فے الخیر۔ ظلموں کی راہ سے بچنا۔ کیا یہ سب باتیں احکام الٰہی نہیں اور کیا یہ احکام نماز۔ روزہ کے احکام سے بروئے تعلیم قرآن کچھ کم حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر اس کے کیا معنی کہ جب ہماری مجالس میں عمل خیر کا ذکر ہو۔ تو اس سے صرف نماز۔ روزہ ہی سمجھا جائے۔ بلکہ ایک نگاہ سے دیکھو تو نماز روزہ حج تو دراصل صرف ذرائع ہیں مقصد تو کچھ اور ہے۔ کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ ترجمہ "تمہیں متقی بنانے کے لئے تم پر تم سے پہلوں کی طرح روزے فرض کر دیئے ہیں"۔ یہی مقصد حج کا یہی مقصد نماز و زکوٰۃ کا ہے۔ کسقدر حیرتناک مقام ہے۔ کہ تم رستہ کو منزلِ مقصود سمجھ رہے ہو۔ ارکانِ اسلام کی ادائیگی تمہیں منزل مقصود کی طرف لیجاتی ہے لیکن یہ بذاتہٖ تو اصلی مقصد نہیں وہ شخص ہرگز متقی نہیں جو پابندِ صوم و صلوٰۃ تو ہے لیکن اپنی روزی کے لئے دوسروں کی طرف دیکھتا ہے جس کی نگاہ غیر کے مال پر ہے۔ جو اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہیں کرتا۔ جو

اپنے مفوضہ فرائض دُنیوی کو ادا نہیں کرتا - جو کسی کام کو شروع کر کے اس کو انجام تک نہیں پہنچاتا - یا اس کام کے کرنے میں اپنی خداداد طاقتوں کو پورے طور پر استعمال نہیں کرتا - جو اُسے شروع کرنے سے پہلے اس کے مالہٗ و ماعلیہ کو نہیں دیکھ لیتا - اسکے کُل اسالیب تکمیل پر حاوی نہیں ہو جاتا - اگر اُسے خود سمجھ نہو تو کسی ماہر سے مشورہ نہیں لے لیتا - جو اپنی غلط کاریوں کے اعتراف یا ان کے چھوڑ دینے کی جُرات نہیں کرتا - جو مختلف علوم و فنون کے اکتساب میں اگر ضرورت پڑے تو کوشش نہیں کرتا - الغرض جس کام میں جو شخص پڑے جب تک اسمیں یدِطولیٰ حاصل نہ کرنے اور اس میں دوسروں پر جائز وسائل سے سبقت لیجانے کا ارادہ نہیں کر لیتا وہ متقی نہیں - اسیطرح جو کسی غلط کار کو بغرض اصلاح اسکی غلطی سے آگاہ کرنے کی جُرأت نہیں رکھتا - جو ایک ناواقف یا غلط راہ پر چلنے والے کو اگر وہ خود جانتا ہو صحیح راہ نہیں بتلاتا - جو خُدا کے دیئے ہُوئے رزق سے خواہ وہ دولت علم ہو یا دولت ہُنر - یا لفظی معنوں میں دولت ہو - دوسروں کو فائدہ نہیں پہنچاتا - جو دشمن صداقت کا مقابلہ نہیں کرتا - اور جو دنیا میں صداقت قائم کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار نہیں ہوتا جو قومی معاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح نہیں دیتا - الغرض جو دین کو دُنیا

پر مقدم کرنا نہیں جانتا۔ وہ نہ متقی ہے نہ مومن۔ ہاں وہ مسلمان ہے۔ کیونکہ کلمہ گو ہے ؏

کچھ عرصہ سے ہمارے دینی مجالس اور مذہبی مذاکرے بھی خاص مضامین پر محدود ہو گئے ہیں۔ جس طرح اور مذاہب والوں کی طرح آجکل کے مسلمانوں نے بھی غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ مذہب کا تعلق چند عبادتوں تک ہے۔ اسی طرح ہمارے مجالس وعظ میں بھی چند ہی باتیں رہ گئی ہیں نماز روزہ کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ بہشت و دوزخ پر زور دیا جاتا ہے یا چند فرائض واجبات مستحب۔ اور وہ بھی محدود دائرہ میں بخبیطۂ بیان آتے ہیں۔ یہی ہماری مذہبی کتابوں کا حال ہے۔ یہ ایک غلط راہ ہے۔ علماء کو چاہیئے کہ وہ قرآن کو ہاتھ میں لیں واقعاتِ حاضرہ پر غور کریں معاملاتِ دنیوی کو پیش نظر رکھیں ہماری شادی غمی کے معاملات۔ ہمارے باہمی تعلقات۔ ہم کس طرح اپنے اپنے کاروبار میں۔ تجارت میں روزگار میں کامیاب ہوں۔ ان سب کے متعلق قرآن میں احکامات ہیں۔ ان احکامات پر چلنے کے لئے قوم کو متوجہ کیا جائے۔ قوم کو قرآنی اخلاق دکھلائے جائیں۔ اور ان کے پیدا کرنے کی وہ راہیں بتلائی جائیں جو قرآن نے تجویز کی ہیں۔ جہاں نماز پر زور دیا جاتا

ہے۔ وہاں اُس کے ساتھ اُنہیں ۔ثبات قدم ۔صبر ۔جفاکشی۔
محنت ۔ وفا شعاری ۔صدق و صفا ۔صحت معاملات دیانت
امانت کا بھی سبق دیا جائے ۔مثلاً سورۃ "مومنون" کے شروع
میں قرآن کریم نے چند مختصر الفاظ میں کامل مذہبی زندگی
کا نقشہ کھینچ دیا ہے ۔ دیکھ لو وہاں اُن باتوں کا
تو اتنا ذکر نہیں جِس کو آج مسلمانوں نے مذہب سمجھ رکھا
ہے ۔ بلکہ اُن باتوں پر زور دیا گیا ہے ۔جنہیں یہ نادان
معاملات دُنیا سمجھ رہے ہیں ۔ قد افلح المومنون
الذین ھم فی صلاتھم خاشعون ہ والذین ھم عن اللغو
معرضون ہ والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون ہ والذین
ھم لفروجھم حٰفظون ہ الا علی ازواجھم او ما
ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین ہ فمن ابتغی
وراء ذٰلک فاولٰئک ھم العادون والذین ھُم
لامٰنتھم وعھدھم راعون ہ والذین ھم علی
صلوٰتھم یحافظون ۔ ترجمہ ۔مومن ہی فلاح پایا کرتے
ہیں جنکی نمازوں میں خشیت ہوتی ہے ۔جو لغو کاموں سے بچتے ہیں۔
جو پاکیزہ اور طہارت سے کام کرتے ہیں ۔ زکوٰۃ دیتے ہیں ۔ اپنے
سوراخوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ ہاں اُن کا استعمال اُن کی
اپنی بیوی اور ما ملکت ایمانھم کے متعلق صحیح ہے ۔ اور

جو اس سے زیادہ کی طلب میں ہیں۔ وہ حد سے گذرتے ہیں فلاح وہی پاتے ہیں جو ایمانیات اور معاملات کی عزّت کرتے ہیں۔ اور جو نمازوں کی محافظت کرتے ہیں +

اِن چند آیات نے ہمارے کُل اعمال پر احاطہ کیا ہوا ہے میں ان کی تفسیر کی یہاں گنجائش نہیں پاتا۔ مجھے صرف اسی قدر کہنا ہے۔ کہ جس بات تک بعض نادان مسلمان اعمال دین محدود کر دیتے ہیں۔ یعنی نماز یہاں اُس کے علاوہ بہشتی زندگی کے حصول کے لئے چند اور باتوں کا بھی ذکر ہے۔ جنہیں شاید یہ امور دنیوی میں شامل کرتے ہیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ چند آیتیں کسی مہذّب سلطنت کے کُل دیوانی و فوجداری قوانین کو اپنے احاطہ میں لے آتی ہیں۔ معاہدات کی عزّت کرنا۔ امانات کا لحاظ کرنا۔ عورت مرد کے رشتوں کی حد بندی۔ لغو باتوں سے بچنا۔ پاکیزگی کی راہوں کو اختیار کرنا۔ صدقہ و خیرات دینا۔ یہی وہ اعمال ہیں جو آج ہم میں نہیں لیکن جن کے پیدا ہونے پر ہی ایک سوسائٹی دُنیا کی بہترین سوسائٹی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آیات ذیل پر غور کیجئے +

وقضی ربك الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندك الکبر احدھما او کلٰھما فلا تقل

لهما اف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما ٥
واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب
ارحمهما كما ربيني صغيرا ٥ ربكم اعلم بما في نفوسكم ط
ان تكونوا صلحين فانه كان للاوابين غفورا ٥
وات ذا القربى حقه والمسكين وابن السبيل ولا
تبذر تبذيرا ٥ ان المبذرين كانوا اخوان الشيطين ط
وكان الشيطن لربه كفورا ٥ واما تعرضن عنهم ابتغاء
رحمة من ربك ترجوها فقل لهم قولا ميسورا ٥
ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك ولا تبسطها
كل البسط فتقعد ملوما محسورا ٥ ان ربك
يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر ط انه كان بعباده
خبيرا بصيرا ٥ ولا تقتلوا اولادكم خشية املاق ط
نحن نرزقهم واياكم ان قتلهم كان خطأ كبيرا ٥
ولا تقربوا الزنى انه كان فاحشة ط وساء سبيلا ٥
ولا تقتلوا النفس التي حرم الله الا بالحق ط ومن
قتل مظلوما فقد جعلنا لوليه سلطنا فلا يسرف
في القتل ط انه كان منصورا ٥ ولا تقربوا مال اليتيم
الا بالتي هي احسن حتى يبلغ اشده ص واوفوا بالعهد ان العهد
كان مسئولا ٥ واوفوا الكيل اذا كلتم وزنوا بالقسطاس

المستقیم ذالک خیر و احسن تاویلا ٥ ولا تقف ما لیس
لک بہ علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک
کان عنہ مسئولا ٥ ولا تمش فی الارض مرحا
انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا ٥ کل
ذلک کان سیئہ عند ربک مکروھا ٥ ذالک مما
اوحی الیک ربک من الحکمۃ ولا تجعل مع اللہ الٰھا
اٰخر فتلقی فی جھنم ملوما مدحورا (سورۂ بنی اسرائیل)
وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا و اذا
خاطبھم الجٰھلون قالوا سلٰما ٥ والذین یبیتون
لربھم سجدا وقیاما ٥ والذین یقولون ربنا اصرف
عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غراما ٥ انھا
ساءت مستقرا ومقاما ٥ والذین اذا انفقوا لم یسرفوا
ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما ٥ والذین لا یدعون
مع اللہ الٰھا اٰخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ
الا بالحق ولا یزنون ومن یفعل ذالک یلق اثاما
یضٰعف لہ العذاب یوم القیمہ و یخلد فیہ
مھانا ٥ الا من تاب وامن وعمل عملا صالحا
فاولئک یبدل اللہ سیاٰتھم حسنٰت وکان اللہ
غفورا رحیما ٥ ومن تاب وعمل صالحا فانہ یتوب

الی اللہ متابا ۝ والذین لا یشھدون الزور واذا مرّوا
باللغو مرّوا کراما ۝ والذین اذا ذکروا بایٰت ربھم
لم یخرّوا علیھا صمّا وعمیانا ۝ والذین یقولون
ربنا ھب لنا من ازواجنا وذرّیٰتنا قرّۃ اعین
واجعلنا للمتقین اماما ۝ اولٰئک یجزون الغرفۃ
بما صبروا و یلقّون فیھا تحیۃ وسلما ۝ (سورۂ الفرقان)

ترجمہ۔ تمہارا رب تمہیں حکم دیتا ہے۔ کہ تم خدا کے سوا
کسی اور کے پرستار نہ بنو۔ والدین سے نیکی کرو۔ اور جب انمیں
سے کوئی بہت ضعیف ہو جائے۔ اور وہ تمہارے پاس ہو
(ایسے وقت اُن میں چڑ چڑا پن پیدا ہو جایا کرتا ہے
اسلئے اُن کے مقابل اُف تک نہ کرو۔ ان سے سختی نہ کرو۔
ان سے نرم گفتگو کرو۔ نہایت عجز اور رحیمانہ طریق
پر ان سے ملائم سلوک کرو۔ ان کے لئے دُعا کرو۔ کہ اے مولا تو
ان پر رحم کر جیسے کہ انہوں نے میری پرورش کی (یعنے اُنکے
حق پرورش کے مقابل پہلے تم ان کے ساتھ مرحمت کرو۔ اور
بتکمیل مرحمت کے لئے خدا سے دعا کرو۔ اسی ذیل میں تمہارے
ضعیف رشتہ دار اور دوسرے ضعیف لوگ آجاتے ہیں۔ تمہارا
خدا تمہارے دل کی بات سمجھتا ہے۔ اگر تم واقعی نیک ہو تو جو
غلطیونکو چھوڑ اسکی طرف جاتے ہیں۔ وہ ان کی غلطی معاف

کر دیتا ہے (یعنی تمہارے نیک کاموں میں ریا کا زنگ نہ ہو۔ غلط کاریاں چھوڑ دو۔ تو خدا بھی تم پر رحم کریگا) اپنے اقربا کو اُن کا حق دیدو۔ مساکین اور مسافروں کو بھی دو۔ لیکن فضولخرچی مت کرو۔ فضولخرچ شیطان کے ساتھی ہوتے ہیں۔ اور شیطان تو خدا کا بڑا ناشکر گزار ہے (گویا فضولخرچی ایک قسم کی ناشکر گزاری ہے۔ اور ناشکر گزار ازدیادِ نعمت نہیں پاتا) ہاں اُن اقربا یا مساکین کو اگر تم کچھ نہ دے سکو۔ اور تمہیں خود خدا سے رحمت کی احتیاج ہے۔ تو تم ان سے نرمی کے ساتھ بات کرو (یعنی کسی سائل کو مت جھڑکو۔ اور اسی صورت میں تم اُسے محروم کرو۔ جب تم اسی چیز کے خدا سے محتاج ہو۔ آخر تم نے بھی خدا سے مانگنا ہے۔ تم بھی جھڑکے جاؤ گے اگر جھڑکی دوگے) نہ ایسی کنجوسی کرو۔ کہ ہاتھ ہی روک لو۔ اور نہ اتنا ہاتھ بڑھاؤ کہ تم خود فاقہ مست ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اور لوگ تمہیں (اس مسرفانہ دہش پر) ملامت کریں۔ خدا جسے چاہے کھلے خزانے بھی دیتا ہے۔ اور وہ اندازسے بھی دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کی باتیں خوب دیکھتا ہے جانتا ہے۔ (یعنی معاملۂ داد و دہش میں تم بعض وقت محض فضولخرچی سے ہاتھ کھول دیتے ہو۔ اور شاید یہ خیال کرتے ہو۔ کہ

خدا بھی تمہیں ویسے دے دیگا۔ یہ سچ تو ہے لیکن وہ بھی
دیکھتا ہے۔ کہ تم فضولخرچی کر رہے ہو یا خیرات کر رہے ہو۔
اس لئے یہ سمجھ لو۔ کہ وہ اندازسے بھی دیا کرتا
ہے) افلاس کے خوف سے بچوں کو قتل نہ کرو۔ روزی تو انہیں
اور تمہیں ہم نے دینی ہے۔ انہیں قتل کرنا ایک کبیرہ غلطی ہے۔
زنا تو کیا اس کی راہوں کے نزدیک بھی نہ جاؤ۔ یہ نہایت
بُری چیز اور خراب راہ ہے (آج بچہ کُشی تو ختم ہوگئی ہے
لیکن آجکل کے تعیّشات اور فضولخرچ تمدن نے اخراجات
اس قدر بڑھا رکھے ہیں۔ کہ مہذب قوموں کے افراد مغرب
میں خوف افلاس سے شادی نہیں کرتے۔ کہیں بچّہ پیدا ہو کر
انہیں تنگدست نہ کر دے۔ یا شادی کر کے پیدائش اولاد کو
روکتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں قتل اولاد کے رنگ میں
آجاتی ہیں۔ صورت اول کا لازمی نتیجہ تعلقات ناجائز۔
یا ان کے مبادیات ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن نے قتل
اولاد کے ساتھ ہی دوسرے امُور کا بھی ذکر کر دیا) کسی کو
ناحق قتل کرنا حرام ہے۔ جہاں کوئی شخص بوجہ قتل
ہو جائے۔ اس کے اقربا کو حق انتقام دیا گیا ہے۔ مگر
انہیں بھی حُدُود سے نہیں بڑھنا چاہئے (انتقام لینے
میں حکومت وقت سے) وہ مدد دئیے جائیں گے۔ یتیموں

کے مال کے نزدیک بھی نہ جاؤ (ہاں) بہتری کے لئے جبتک کہ وہ بالغ ہو جائیں۔ اس وقت وعدے پورے کر دو۔ یاد رکھو جو وعدہ کرو گے اسکی پرسش ہوگی۔ جب ماپ تول کرو۔ تو بالکل صحیح ماپ تول کرو۔ یہ اچھی بات ہے۔ اس کا نتیجہ بھی اچھا ہوگا۔ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو۔ اس کے پیچھے مت لگ جاؤ۔ دل۔ کان۔ آنکھ ان سب کے متعلق تم سے پوچھا جائیگا (یعنی جو بات تم نے آنکھ سے نہ دیکھی ہو۔ اور اپنے کان سے نہ سنی ہو۔ اس معاملہ میں کسی کے خلاف کچھ ٹھان کر کوئی رائے نہ قائم کرو۔ اور نہ اس پر عمل کرو) زمین پر اکڑ کر چلنا نہ چاہئے۔ نہ تم زمین کو ہی پھاڑ سکتے ہو۔ اور نہ (اکڑ اکڑ کر) پہاڑ تک اونچا ہو سکتے ہو۔ یہ تمام بری باتیں ہیں۔ اور خدا کی نگاہ میں نفرت انگیز۔ یہ سب (مذکورہ بالا) حکمت کی باتیں خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ تمہیں بتائی ہیں۔ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کر لینا (یعنی ان احکام کے خلاف اگر کوئی اور شخص تمہیں کہے اور تم اسکی بات مان لو تو تم نے اسے شریک خدا بنا لیا۔ اس سے تم زیر ملامت ہو کر دوزخ میں ڈالے جاؤ گے" (بنی اسرائیل)

"اور رحمان کے بندے انکسار سے زمین پر رہتے ہیں جاہل انہیں جہالت سے خطاب کرتے ہیں۔ وہ ان پر سلام بھیجتے ہیں

راتیں خدا کے سامنے سجود و قیام میں گذارتے ہیں۔ اور دُعا کرتے ہیں۔ کہ جہنّم کا عذاب بہت بڑا ہے۔ اور وہ ٹھہرنے کے لئے بہت ہی بُرا مقام ہے ہمیں اس سے بچا لیجیئو۔ یہ لوگ خرچ کرنے میں نہ اَسراف کرتے ہیں۔ نہ کنجوسی بلکہ اعتدال کی راہ پسند کرتے ہیں۔ وہ خدا کے سوا کسی اَور سے کچھ نہیں مانگتے۔ وہ کسی کو سوائے حکم خُدا قتل نہیں کرتے۔ وہ زنا نہیں کرتے۔ اور جو ایسی باتیں کریگا وہ اپنی سزا تک پہنچیگا۔ بلکہ قیامت کو یہ عذاب دُگنا ہو جائیگا۔ اور وہ حقارت کی حالت میں رہیگا۔ ماسوا اُن لوگوں کے جو توبہ کریں۔ اور عمل نیک کریں تو اللہ تعالےٰ ان کی بدیوں کو نیکیوں میں متبدّل کر دیگا۔ اللہ تعالیٰ رحیم اور غفوُر ہے جو یہ باتیں کرتے ہیں۔ اور نیک کام کرتے ہیں۔ وہ ہی صحیح توبہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ جھوٹی شہادت نہیں دیتے۔ اُن کی راہ میں اگر کوئی لغو امر آجائے تو بلند نظری سے درگذر کر جاتے ہیں۔ اُنہیں جب خُدا کے اَحکامات یاد دلائے جائیں۔ تو وہ اندھوں اور بہروں کی طرح اُسے نہیں دیکھتے۔ وہ خدا کی جناب سے دُعا کرتے رہتے ہیں۔ کہ ہماری بیبیوں اَور ہمارے بچّوں کو۔ ہماری آنکھوں کی خُوشی کا موجب کر دے۔ اور ہمیں متقیوں

کا امام کر (یعنے پہلے ہمیں متقی بنا) ان ہی لوگونکو بلند مقام دیئے جائیں گے۔ اور یہ سلامتی اور تحیّات کو پائیں گے۔ (سورۂ الفرقان) +

یہ احکامِ الٰہی کسی تفسیر کے محتاج نہیں۔ مجھے صرف اسی قدر کہنا ہے۔ کہ اسلام نے تمہاری زندگی کے ہر امر کو دین بنا دیا ہے۔ تمہارے ہر ایک معاملہ کا جو بہترین پہلو ہو سکتا ہے اُسے قرآن نے دینی فرائض میں داخل کیا ہے۔ یہی وہ اعمال ہیں جو آج ہم میں نہیں۔ انگریزی مذاق کے لوگ (Good Citizenship) (عمدہ شہریت کے) صفات کے مفہوم سے خوب واقف ہونگے ایک اچھے شہری (Good Citizen) کے جو فرائض ہو سکتے ہیں۔ وہ از روئے تعلیم قرآن ایک مومن کی ادنےٰ شان ہے۔ اور جس مسلمان میں وہ باتیں نہیں وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ مومن وہ ہے۔ جو کسل۔ جُبن۔ بے حوصلگی بُزدلی کے نام سے بھی آشنا نہیں۔ جو غیر اللہ کا خوف نہیں جانتا اسی طرح تجارت اور کسبِ معیشت میں مومن وہ ہے۔ جو اپنی تجارت کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ مگر ساتھ ہی ناجائز وسائل سے بچتا ہے۔ مومن طالب علم وہ ہے۔ جس کا عملاً نصب العین امتحان میں سب سے سبقت لیجانا ہے۔ جہاں مومن کی دولت بے حد ہونی چاہئے

وہاں مومن کی فیاضی بھی دوسروں کی احتیاج کے دفعیہ میں کسی سے کم نہیں ہو سکتی +

اب میں برعایتِ اختصار اُن چند امور کا ذکر کرتا ہوں جو انسانوں میں قوّتِ عمل کو نہ صرف کمزور ہی بلکہ معدوم کر دیتے ہیں چند معتقداتِ باطل دیگر مذاہب و ملت سے ہم میں آ گئے ہیں۔ جن سے ہماری طاقتِ عمل نہ صرف سلب ہی ہو گئی ہے بلکہ ہمیں عمل پر ایمان ہی نہیں رہا۔ گو قرآن کریم نے کھول کھول کر ان غلط عقاید کی تردید کی لیکن ہم میں وہ غلطیاں آ ہی گئیں۔ اور کیوں نہ آتیں۔ جب عام مسلمانوں نے قرآن پڑھنا چھوڑ دیا۔ اور دینی مدارس کے نصاب میں قرآن کو بہت کم حصّہ دیا گیا۔ باتیں تو بہت سی ایسی ہیں جو فقدانِ عمل کا باعث ہوتی ہیں لیکن یہاں میں چند موٹی موٹی باتوں کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ امور اپنے اصلی رنگ و مفہوم میں صداقتہائے حقّہ ہیں لیکن اُن کے غلط مفہوم نے کِشتِ عمل کو برباد کر دیا۔ ایمان۔ دُعا۔ شفاعت فدیہ کفّارہ۔ تقدیر۔ یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جن کو صحیح معنوں میں نہ سمجھنے سے مُسلمانوں کی ہمّتیں ٹوٹ چکی ہیں۔ وہ دفعِ مصیبت کے لئے یا روزانہ زندگی میں بھی اسباب ضروریّہ حاصل کرنے میں ہمہ تن اس لئے کوشش نہیں کرتے

کہ کسی کی دعا کسی کی سفارش ان کے کام آسکتی ہے۔ کبھی ایمان کے ہوتے ہوئے وہ عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ پھر ان لیو تھر کی طرح آج اکثر مسلمانوں کی زبان پر بھی یہ غلط عقیدہ آگیا ہے۔ کہ ہمیں عمل کی کوئی ضرورت نہیں ایمان کافی ہے سب سے بڑھ کر مصیبت مسئلہ تقدیر کے مفہوم باطل نے ڈالی ہے ہر ایک خیال کرتا ہے۔ کہ جو کچھ میرے لئے ہونا تھا وہ ہو چکا میری کوششیں جف القلم کے لکھے ہوئے کو کب مٹا سکتی ہیں یہ عقیدہ قوم تو درکنار۔ انسان کو انسان بھی نہیں رہنے دیتا اور پھر سب سے زیادہ مزہ دار بات یہ ہے کہ اس بات پر بھی کسی کا عملی ایمان نہیں ہوتا۔ بیماری کا یہ علاج کرتے ہیں مصیبت کے وقت یہ حتے الوسع ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ احتیاج کے پیدا ہوتے پر یہ اسباب کے مہیا کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ اگر تقدیر کو مشہورہ معنوں میں یہ ماننے والے تھے۔ تو پھر ان کی یہ جد و جہد کیا معنے رکھتی ہے۔ ایک طرف وہ کہتے ہیں کہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ دوسری طرف کسی مصیبت پیش آمدہ کے دفعیہ میں کوشش کرکے خود اس عقیدہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ ہاں اپنی بدعملیوں اور اپنی بدکاریوں کے نتائج بد کو پاکر اپنے مصائب کو جو ان کے اپنے ہی فعل کا نتیجہ ہوتا ہے قسمت کے حوالہ کرکے دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح نفس لوامہ

کی اُس آواز کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ جس نے نتائج بد پر ملامت کرکے انہیں راہ راست پر لانا تھا +

غلط مفہوم ایمان

اِس سے پہلے میں کسیقدر تفصیل کے ساتھ مسئلہ عقاید ایمان اور عمل پر بحث کر چکا ہوں۔ جس کا نام عیسائی یا کسی اور مذہب میں ایمان ہے اُسے قرآنی ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ وہاں چند چیزوں کا مان لینا کسی کے ایمان کے لئے کافی ہے۔ یہاں تکمیل ایمان کے لئے عمل لازمی ہے۔ حُسن عمل حسن عقیدہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن کسی کی بدعقیدگی کسی کے عمل صحیح کو ضائع نہیں کردیتی۔ ایک دہریہ بھی صادق القولی کے ثمرات اُٹھا سکتا ہے۔ اور ایک خدا کی ہستی کا قائل اور قرآن کو من جانب اللہ جاننے والا کذب و افترا کے بعد طوق لعنت سے آزاد نہیں ہوسکتا فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ (جو ذرہ برابر نیکی کریگا وہ اُسے پالیگا۔ اور جو ذرہ بھر بدی کریگا وہ اُسے پالیگا) کا سچا اور اٹل اصول کسی شرط استثنے کے ساتھ قرآن نے مربوط نہیں کیا۔ وہ لوگ غلطی

ہیں - جو حُسن اعتقاد کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں - یہ در اصل عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ نجات کے لئے ایمان ہی کافی ہے عمل کی ضرورت نہیں - اسمیں شک نہیں کہ قرآن میں کفّار کے حبط اعمال کا ذکر آیا ہے لیکن عدم تدبر نے یہ نتیجہ نکالا ہے - کہ ایک کافر کا عمل خدا کی جناب میں قبول نہیں - کیوں ان آیات کو ہی نہیں دیکھ لیا جاتا جہاں حبطِ اعمال کا ذکر ہے وہاں صاف صاف اُن اعمال کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے جن کا حبط ہونا خدا فرماتا ہے - مثلاً اسلام کی ترقی یا اشاعت کے خلاف یا اسلام کے مٹانے کے خلاف جسقدر وہ لوگ کوشش کر رہے تھے قرآن بطورِ پیشگوئی کہتا ہے - کہ اُنکے یہ سب اعمال ضائع ہونگے - الغرض اِن آیات میں کُفّار کے جن اعمال نے حبط ہونا ہے ذکر کر دئے گئے ہیں - نہ یہ کہ ان کا ہر ایک عمل +

اسی غلطی سے والبتہ ایک اَور غلطی ہے - وہ دین اور دُنیا کو دو الگ چیزیں قرار دینا ہے - مثلاً عیسائی سرگل میں چند ایمانیات اور اُس کے ساتھ چند مذہبی رسُوم ہیں جیسے گرجے میں جانا - یا عشاءِ ربّانی وغیرہ میں حصہ لینا انکے نزدیک اِن پر مذہب ختم ہو جاتا ہے - پھر جو ان کی دُنیا ہے اس کے لئے وہ ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں - یہی حال ایک حد تک ہندو دُشمن بھی ہے - جب تک عیسائی مذہب کے جان دادہ رہے تمدن

بے بہرہ رہے۔ چنانچہ ایام وسطی کے یورپ کو ہم مذہب میں تو بڑا سرگرم پاتے ہیں لیکن تمدن اسباب راحت و ثروت سے اسے خالی دیکھتے ہیں۔ یورپ نے آہستہ آہستہ مذہب کو جواب دینا شروع کیا۔ اور تمدن کی راہیں مسلمانوں سے لیکر موجودہ حالت کو پہنچگیا۔ عیسائیوں میں اگر مذہب کے چرچے اس وقت ہیں تو ساتھ ہی یہ امر بھی اُن کے سامنے بطور دستور العمل ہے کہ فلاح دنیوی و اُخروی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ چنانچہ اُن کا ایمان یہ ہے۔ کہ اگر وہ چند شعار مذہبی ادا کرلیں تو وہ اُنکی نجات اُخروی کے لئے کافی ہیں۔ لیکن دنیوی فلاح کے لئے انہیں دُنیوی اصُول پر جدوجہد کرنی ہوگی۔ اُن کے نزدیک اسمیں مذہب کو کوئی دخل نہیں۔ وہ دنیا کمانے میں جو راہ اچھی یا بُری مفید دیکھیں اختیار کرلیں۔ مذہب کو اس میں دخل نہیں۔ یہ امر اُن کے طریق عمل سے پایا جاتا ہے۔ اس اصُول سے جسقدر اتلاف حقوق غیر ہوگا یا جسقدر ظلم و استبداد ہوگا وہ تو ظاہر ہے مگر دنیا کمانیکے لئے قوت عمل پر مذہب کوئی اثر نہیں ڈالیگا۔ دراصل عیسائی مذہب کے اصُول ہی ایسے تھے جو عمل کو مسلوب کرکے انسان کے تمدن کو روکتے تھے۔ یورپ اپنی مذہبی دور میں تہذیب و ترقی سے خالی رہا۔ اسے اسباب آسائش اس وقت ہی میسّر ہوئے

جب اہل مغرب نے اپنے مذہبی معتقدات کو کسب دُنیا سے الگ کر دیا۔ اسلام نے اس غلطی کو نکالا۔ اس نے جہاں مذہب کو ہر ایک بات پر مقدّم کیا۔ وہاں بہترین تمدّن۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیب عمدہ سے عمدہ معاشرت کا حصُول ان سب کو اجزائے مذہب ٹھہرا دیا تاکہ ایک طرف مسلمان افلاس و فلاکت کا شکار نہ ہوں دوسری طرف حصُول دنیا میں اتلاف حقُوق وظلم سے بچ جائیں۔ لیکن مرُور ایّام نے اصل حقیقت چھُپا دی۔ ہم نے بھی اوروں کی طرح دین و دُنیا دو الگ چیزیں قرار دیں۔ مگر دین کی تقدیم ہمارے سر میں قائم رہی۔ ہم گھر کے رہے نہ گھاٹ کے دین ہمنے چند شعار کا نام سمجھ لیا۔ اور اسکو مُقدّم کر کے دُنیا کو گنوا دیا۔ اگر دین کی یہی حقیقت تھی تو بہتر ہوتا۔ کہ ہندو اور عیسائیوں کی طرح ہم میں بھی یہ خیال پیدا ہو جاتا۔ کہ حصُول دُنیا میں دین کو کوئی تعلق نہیں۔ یہاں کی دُنیوی زندگی عقبےٰ پر اثر نہیں ڈالتی۔ وہاں کی بہتری یا بُرائی کا تعلق چند معتقدات یا چند شعار کے ہونے یا نہ ہونے پر ہے پھر ہم یقیناً دُنیا میں کسی قوم سے پیچھے نہ ہوتے اخلاق فاضلہ تو ہم میں نہ ہوتے۔ اور وہ ثواب بھی نہیں۔ لیکن افلاس بھی نہ ہوتا۔ اسلام تو دنیا کو یہ سکھلانے آیا تھا کہ دنیا اور عقبیٰ کوئی ایسی دو جُداگانہ چیزیں نہیں۔ کہ ان کے حصُول کے طریق جُداگانہ

ہوں۔ بلکہ دُنیا تو مزرعۂ آخرت ہے +

اگر عقاید اور ایمان بلا عمل ہی ہمارے لئے کافی ہوتا تو پھر جناب فاطمہؓ کو عمل کا حکم نہ ہوتا۔ کیا آنحضرت صلعم سے ہمارا ایمان زیادہ مضبوط ہے؟ پھر اُن سے بڑھ کر عمل کی عزت کرنیوالا دُنیا میں کون پیدا ہؤا۔ آپؐ کی زندگی اور آپؐ کی کامیابی دُنیا کے لئے ایک سبق ہے۔ ایک ذات مقدس جو پیدائش سے اخیر تک منشاء ایزدی کے مطابق چلے جسے اول المسلمین کا سرٹیفکیٹ ملے۔ ایک خدا کا محبوب جسے آغاز ماموریت میں ہی ہر قسم کی فتح و نصرت کا وعدہ دیدیا جاوے پھر وعدہ فتح و نصرت دینے والا بھی وہ قادر مطلق خدا ہے جس کی شان لا یخلف المیعاد ہے۔ وہ قدیر علیم خدا اُسے ابتدائے زندگی میں کہتا ہے۔ ورفعنا لک ذکرک یعنی یہ نہیں کہ تیرا ذکر ہم بلند کردیں گے۔ بلکہ ہم نے کردیا ہے صیغۂ ماضی ایسے موقعوں پر کامل یقین دلانے کے لئے بجائے مستقبل کے بولا جاتا ہے۔ اُسے کہا جاتا ہے۔ کہ تیرے دشمن ہلاک ہونگے تیرا دین دُنیا میں پھیلجائیگا۔ تیرے نام لیوا دُنیا کے چار گوشوں میں ہونگے۔ الغرض خدا کی طرف سے ہر ایک خیر و برکت کا وعدہ اُسے اُسکی زندگی میں ہی ملجاتا ہے۔ پھر ایسے شخص کو کسی کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب اسے سیھزم الجمع ویولون الدبر

(دشمنوں کے سردار نیچا دیکھیں گے۔ اور تیرے مقابل والوں کو ہزیمت ہوگی) کا وعدہ مل چکا ہے تو پھر دشمن کے آجانے پر میدان میں وہ کیوں نکلتا ہے اس کے لئے تو یہ ہی بہتر تھا کہ وہ اس وعدہ کی تسبیح خود بھی کرتا اور اپنی جماعت سے بھی کراتا لیکن وہ تو زمین کو اپنے ساتھیوں کے خون سے تر بتر کرا دیتا ہے۔ فتح جنگ کے لئے ہر قسم کی تیاری کرتا ہے۔ اُسے تو خداوند کی طرف سے (واللہ یعصمك من الناس) حفاظت جان کا حتمی وعدہ مل چکا ہے۔ وہ کیوں جنگ میں جانے سے پہلے زرہ پہنتا ہے۔ اسلاح سے آراستہ ہوتا ہے فوج کا میمنہ اور میسرہ درست کرتا ہے۔ جنگوں کے علاوہ اسکی زندگی کا کونسا حصّہ ہے جسمیں ابتدا ہی سے اُسے کامیابی کا وعدہ خدا سے نہیں مل چکا۔ پھر تم اُن وعدہ شدہ کامیابیوں میں مجھے ایک بات نہیں دکھلا سکتے۔ جس کے حصول میں اُس نے قوت عمل کا کوئی دقیقہ چھوڑا ہو۔ اگر صاحب لولاك کی یہ حالت ہے تو ہم آجکل کے مسلمان جن کا نہ دین نہ ایمان درست ہے خدا کے سامنے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ محمیت مآب نے اس طریق عمل سے ہم پر یہ ثابت کیا۔ کہ تم خدا کی وعدہ کردہ کامیابی کے حصول میں بھی خدا پر یہ ثابت کردو۔ کہ تم نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ اِس شرط پر ہی تم کامیابی کا منہ دیکھ سکتے

ہو ۔ پیشینگوئیاں ازدیاد ایمان کرکے قوت عمل کو مضبوط کردیتی ہیں ۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو ارض مقدس کا وعدہ دیا گیا ۔ لیکن ارضِ موعود اس خدا کے پیارے کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی ۔ اسکی نسل کے لوگ وادی عرب میں تباہ ہوگئے ۔ اسکی وجہ یہی تھی ۔ کہ انہوں نے بھی آجکل کے مسلمانوں کی طرح عمل سے جان چرائی ۔ جب اُن کی راہ میں مصائب آئے تو ھہنا قاعدون کہ دیا ۔ موسیٰ صاحب آپ اور آپ کا خدا جائے ہم تو یہاں بیٹھتے ہیں ۔ انہوں نے یہ کہ کر عمل کو چھوڑا خدائتعالیٰ نے ایفائے وعدہ کو چالیس برس پیچھے ڈالدیا جب یوشعؑ کے ہمراہ ایمان کو عمل کا لباس دینے والی قوم پیدا ہوئی ۔ تو پھر بیتُ المقدس کا ملنا تو ایک وعدہ شدہ امر تھا ۔ مثیل موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی موسیٰؑ سے کہیں بڑھ کر کامیابیوں کے وعدے دیئے گئے تھے ۔ اگر موسیٰؑ کے رفقاء کا رنگ رفقائے مصطفوی میں بھی ہوتا ۔ تو پھر اسلام کی ابتدائی تاریخ کا رنگ ہمارا آجکل کا موجودہ رنگ ہوتا نہیں اُنہوں نے تو اپنے مُقتدا سیدالعرب والعجمؐ کو عرض کیا ۔ کہ ہم موسیٰؑ کے ساتھی نہیں ہیں ۔ کہ آپؐ کو اذھب انت وربک کہیں ۔ ہم تو تیرے آگے پیچھے ۔ اِدھر اُدھر جان تک لڑا دینگے یہ زبانی وعدہ نہ تھا ۔ جنگ اُحد میں لفظاً لفظاً پورا ہوگیا

کس طرح اُن مردانِ خدا نے اپنے زخمی شدہ سالار کے اردگرد کھڑے ہو کر آدمیوں کی ایک چار دیواری کھڑی کر دی۔ اور دشمن کے تیروں کو اپنی چھاتیوں پر سہا۔ لیکن تیر کے کسی ٹکڑہ تک کو بھی علیہ الف الف صلوٰۃ کے جسم تک نہ پہنچنے دیا۔

قرآن کریم نے اِن دو واقعوں کا کیوں ذکر کیا۔ اور ان اقوال کو کیوں دُہرایا۔ جو اصحاب موسیٰؑ اور اصحاب محمدؐ نے آڑے وقتوں پر کہے۔ صرف اسی لئے کہ دونوں خدا کے مقرب نبی ہیں۔ دونوں میں مماثلت ہے۔ دونوں کو کامیابی کا وعدہ دیا گیا ہے۔ دونوں بذات خود صاحبِ عمل ہیں لیکن ایک اپنی قوم کی بے عملی کے باعث کامیابی تک نہیں پہنچتا اور دوسرے کی قوم کا عمل اُسے ہر کامیابی کا مالک بنا دیتا ہے

اچھّا آج اس یاس و حسرت کے وقت اس بےکسی اور نااُمیدی کے زمانہ میں ایک کامیابی کا وعدہ ہے۔ اسلام کے کامل انحطاط پر اسکی ایک زبردست کامیابی مقدر ہے

مخبر صادقؐ

ہمیں یقین دلاتے ہیں۔ کہ جب عیسویت۔ جب دجّال جب یاجوج ماجوج جن کا نشان من کل حدب ینسلون ہے اپنے زعم میں اسلام کو مٹا چکے ہونگے۔ اس وقت پھر اسلام غلبہ پائیگا۔ تم کسی فرقہ کے ہو۔ تم یاجوج ماجوج دجّال سے جو مرضی ہو

مُراد لو تم ظہورِ مہدی یا نزولِ مسیح کو جن معنوں میں چاہو قبول کرو لیکن اِس ایک امر سے تم انکار نہیں کر سکتے - کہ اسلام کا انحطاط اور اُن قوموں کا غلبہ جو اپنے آپ کو عیسیٰ کے نام سے منسُوب کرتی ہیں - اس سے بڑھ کر اور قیاس میں نہیں آسکتا - دُنیا میں کونسا حصّہ ہے - جہاں یہ متقابلہ حیثیتیں پیدا نہیں ہو چکیں - اسلامی کامیابی کے وعدہ کا وقت تو حسبِ اطلاع مخبرِ صادقؐ آچکا - لیکن اس وعدہ کا پُورا ہونا اُن ہی شرائط کو چاہتا ہے جن کا ذکر میں نے اصحابِ موسیٰ اور اصحابِ نبوی کے متعلق کیا ہے - یہ وعدہ بھی موسیٰ کے وعدہ کی طرح ٹل سکتا ہے یا وعدۂ مصطفوی کی طرح پُورا ہوسکتا ہے - یہ دونوں حالتیں اُس جماعت کی قوتِ عمل پر منحصر ہیں جس کے متعلق یہ وعدہ ہے کامیابی اپنے کامل شان وشکوہ کے لباس میں ہم سے کچھ فاصلہ پر کھڑی ہمارا انتظار کر رہی ہے - لیکن وہ محبوبہ خود کسی کیطرف نہیں آتی - اس کے شیدا خود اسکی طرف جائیں تو وہ کھلے بندوں اپنے عشاق سے بغلگیر ہو جاتی ہے - یاد رکھو ! حالتِ قعود حالتِ جمود ہوتی ہے - حرکت میں ہی برکت ہے - میرے اپنے اجتہاد میں یاجوج ماجوج استبداد کی اُن دو شکلوں کا نام تھا جنہیں جنگ سے پہلے روسی مطلق العنانی اور جرمن ملٹری ازم

کہتے تھے۔ اس جنگ نے اُن دونوں کا خاتمہ کر دیا۔ خود مقدس صحیفے کھلے لفظوں میں روس کا یاجوج ہونا بتلاتے ہیں۔ اور بعض مسلمان متکلمین نے اس جنگ سے بہت پہلے یاجوج سے مراد جرمن لی ہے۔ دراصل یاجوج ماجوج و دجال حکومت دنیوی کے ان خط و خالوں کا نام ہے جو فی زمانا مختلف حکمرانوں میں خواہ وہ کسی قوم و ملت سے تعلق رکھتے ہوں کم و بیش پائے جاتے تھے اور اگر سچ پوچھو تو دجالیت ڈپلومیسی کا دوسرا نام ہے۔ اگر کہنا کچھ اور کرنا کچھ یا معاملات سلطنت میں ارادتاً اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا۔ کہ حسب ضرورت اس کے معنے جو چاہیں لے لئے جاویں ڈپلومیسی کی تعریف میں آتا ہے تو پھر دجالیت کے بھی قریب قریب یہی معنے ہیں۔ یہ باتیں نہیں چل سکتیں اب یہ ختم ہو کر رہیں گی۔ اور آیندہ کی سلطنت کسی قوم کی ہو وہ اسلامی اصولوں پر ہوگی۔ آیندہ کوئی قوم کسی بھی مذہب و ملت کی صاحب سلطنت ہو۔ اس کا عمل اسکے اصول اسلامی ہونگے۔ ہاں ان قوموں کو اس امر سے آگاہ کرنا اُن پر یہ ظاہر کرنا کہ تم ایک حد تک عملاً مسلمان ہو۔ یہ ہم مسلمانوں کا کام ہے۔ آج بھی یورپ اور مغربی دنیا۔ اپنے تمدن اپنے اصول اخلاق۔ اپنے طریق حکومت اور بعض دیگر امور میں

بہت حد تک اسلامی اصولوں پر چل رہی ہے۔ میٹریلزم نے جس کا دور دورہ گذشتہ سَو۔ اسّی سال رہا۔ اور جس پر اس جنگ نے عیسائیت کی طرح موت وارد کردی۔ ان قوموں میں خود غرضی اور نفس پرستی پیدا کر رکھی ہے۔ اس کا احساس بھی اس جنگ نے مغربی اقوام میں پیدا کردیا ہے۔ رُوحانیت کی جو لہریں مغرب میں اُٹھ رہی ہے۔ اور دِلوں میں مذہبی ہیجان پیدا کررہی ہیں۔ اُنہیں عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں۔ بحر حقیقت کے غوّاص اُن لہروں میں بہت حد تک اسلامی تموج دیکھ رہے ہیں۔ مُسلمان پھر اُٹھیں اور ان لہروں میں غوطہ لگانیوالوں کو اپنے رنگ میں رنگین کردیں۔ تلوار کا دور ختم ہوچکا ہے۔ جس پر یضع الحرب کی حدیث شاہد ہے۔ اتحادیوں کی حکومت ہو یا اُن کے غیروں کی۔ ان میں سے میٹریلزم اور استبداد رُوسیہ جا چکا ہے۔ جیسے حدیثوں میں آیا تھا یاجوج ماجوج آپس میں لڑکر مر چکے ہیں۔ ہاں دجّالیت کا رنگ سلطنتوں میں ہے۔ ایک ادنےٰ مثال اسکی جاپان ہے۔ جس کی حقیقت دن بدن کھُلتی جاتی ہے۔ خود صاحبِ حکُومت اس سے متنفّر ہوتے جائیں گے۔ اور طرزِ حکومت وہ ہوجائیگا جو آسمانی بادشاہت* کا رنگ ہونا چاہیئے۔ جس کے لئے جناب عیسیٰؑ نے دعا کی۔ اور جس کا چارٹر قرآن کریم دنیا میں لایا۔

* اسکی تفصیل ہم نے اپنی کتاب التوحید فی الاسلام حصہ اول میں کی ہے۔ منہ

حقیقت دُعا اور اُس سے نا آشنائی

دُعا اور قبولیت دُعا بھی ایک پیچیدہ اور انسانی سیرت پر مختلف اثرات ڈالنے والا مسئلہ ہے۔ اگر ایک طرف منکر دُعاء آہستہ آہستہ دہریت تک پہنچ جاتا ہے۔ تو دُعا کا قائل اس کی حقیقت سے نا آشنا ہونے پر بعض وقت اپاہج ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی کُل کوششوں کا قائمقام دعاء کو ٹھیرا کر اپنے کُل قوی کو حالت جمود میں لے آتا ہے۔ اپنی دُعاؤں کو بے اثر سمجھ کر دوسروں کی طرف رُخ کرتا ہے۔ جس سے پیر پرستی۔ گور پرستی۔ گنڈہ تعویذ آہستہ آہستہ اسکے معبود اور قاضی الحاجات بن جاتے ہیں۔ عیسوی کفارہ بھی اسی قسم کی بد اعتقادیوں سے مذہب کے مزاج پر مسلط ہو گیا۔ یہ ساری غلطیاں حقیقت دُعا سے نا آشنائی کا نتیجہ ہے +

دُعا اور اسکی قبولیت پر بحث کرنا ان اوراق کا موضوع نہیں۔ اسکے متعلق شاید اسی قدر کہہ دینا کافی ہوگا۔ کہ خالق و مخلوق میں رشتہ عبودیت کے قائم اور مضبوط رکھنے کا ایک مستقل ذریعہ دُعا اور اسکی مقبولیت ہے۔ ہماری احتیاج ہی ہماری گردن جُھکاتی ہے دفع احتیاج کے لئے ہی ہم کسی بالاتر

طاقت کو دیکھتے ہیں - احتیاج ہی تکبّر اور نخوت کا بہترین علاج ہے - دُعاء در اصل اس خواہش یا آرزو کے اظہار کا نام ہے جو دفعِ ضرورت کے لئے ہماری زبان پر آجاتا ہے - اب اگر کوئی بالاتر ہستی اس آرزو کو پُورا نہیں کر سکتی تو پھر اس کی طرف اِنسانی طبیعت کا مائل ہونا یا اُمید و بیم میں نگاہ کا اسکی طرف اُٹھنا ایک امرِ محال ہے - خدا کے متعلق صرف اسی قدر ایمان رکھنا کہ جو اُسنے کرنا تھا کر دیا - وجوہات بالا کی بناء پر انسان کو منزل بہ منزل تشکک - مادیت پرستی - اور پھر دہریت تک پہنچا دیتا ہے - در اصل ایسے خدا کے ماننے کی ضرورت بھی نہیں - وہ تو اُس باپ کی طرح ہے جو جوشِ حیوانی کے ماتحت کسی عورت کے سپرد تخمِ انسانی کر کے بچہ کی پیدائش سے پہلے کہیں نکل جاتا ہے - اور پھر عمر بھر کے لئے بچّہ کی پرواہ نہیں کرتا - ایسے والد اگر دُنیا میں اولاد سے عزّت کے مستحق نہیں ہو سکتے خصوصاً جبکہ اُن کا یہ فعل ارادہ سے ہو تو پھر ایسا خالق جو نشاءِ عالم کے بعد اس کی آیندہ نشو و نماء کی پرواہ نہ کرے - کس عبادت کا مستحق ہو سکتا ہے قبولیتِ دعا ہی خدا پرستی کی جان ہے - یہ پیارا اور اُمید افزاء اعلان

اِنّی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان

مَیں قریب ہوں - جب دُعا کرنیوالا دُعا کرتا ہے تو میں جواب بھی دیتا ہوں

انسان کو قائل خدا نہیں بلکہ خدا پر قربان ہونے کے قابل کر دیتا ہے - اسی نے صدیق اور شہید دُنیا میں پیدا کئے - یہی مایوسیوں اور خودکشیوں کا علاج ہے - ایک منکرِ دُعا جس کا بھروسہ صرف اسباب دنیا پر ہوتا ہے - وہ ناکامیوں کے وقت خودکشی کا مُنہ دیکھتا ہے - یہ خودکشی خواہ اسکی ہستی کو مٹا دے یا اس کے دائرہ عمل کو مٹا دے - دُنیا ان دونوں کی مثال سے خالی نہیں - بڑے باہمت انسان جو ایک وقت دنیا کو اپنی قوتِ عمل سے ہلا رہے تھے - وہ ناکامی کے وقت شکارِ یاس ہوکر ہمیشہ کے لئے دُنیائے عمل سے مرجاتے ہیں - یہ خودکشی عمل جس سے بچنے کا علاج صرف ایمان بر دُعا ہوسکتا ہے - اُس پہلی خودکشی سے بدرجہا بدتر ہے +

ہاں یہ سچ ہے - کہ دُعا کے صحیح مفہوم کے نہ سمجھنے نے دُنیا میں بے عملی - بیکاری - اپاہج پن سُستی غفلت پیدا کردی ہے - ایک متشکک جب ایک طرف منکرِ دُعا یورپ کو دیکھتا ہے - جہاں قُوتِ عمل کے معجز نما کرشمے بیابان کو بہشت بنا رہے ہیں - اور دوسری طرف وہ ہندو اور مُسلم دنیا کو دیکھتا ہے جہاں دُعا اور اسکی قبولیت پر ایمان رکھنے والے اپنی غفلتوں اور بیکاریوں سے بنے بنائے بہشت کو دوزخ بنا رہے ہیں - ان حالات میں اگر اس کا تشکک انکار تک پہنچ جائے

تو عجب نہیں +

ایک مغربی سیّاح جب مشرق کے گلی کوچوں کو گداگروں سے پُر پاتا ہے جو اُسے مغرب میں نظر نہیں آئے۔ اور اس قوّت عمل اِنسانی کے فقدان کا مُوجب تلاش پر وہ اس خیرات و صدقات کو پاتا ہے جس کا دروازہ ایک ہندو اور مسلمان ہر سائل پر کھول دیتا ہے۔ تو اس ساری بیکاری اور آوارہ حالی کا موجب اگر وہ ان خیرات دہندگان کو ٹھیرائے تو یہ ایک صحیح نتیجہ ہوگا۔ متھرا کے چوبے اور ہردوار کے پانڈے ایک طرف اور مُسلم خانقاہوں کے مجاور دوسری طرف کس قدر ہندوستان کی محنت اور عمل کو حالتِ جمُود میں رکھے ہُوئے ہیں۔ میرے نزدیک ہندوستان کی ایک تہائی سے زیادہ قوت عمل اِن خانقاہ نشینوں اور مندر نواسیوں نے تباہ کردی ہے۔ لیکن اِس تباہی کا اصلی مُوجب وہ ہندو مسلمان جیب ہے جو خانقاہوں اور تیرتھوں پر بلا تامل کُھل جاتی ہے۔ ہم آج اگر اپنی خیرات و صدقات کو یورپ کی طرح حالت تنظیم و ترتیب میں لے آئیں۔ اور یہ وہ طریق ہے جو مہذّب مغرب نے قرآن سے سیکھا ہے۔ تو آج ہماری زیارت گاہیں ان بیکاروں سے خالی اور ہمارے گلی کوچے ان آوارہ گردوں سے پاک ہوجائینگے ہندوستان کی محنت میں ایک معتدبہ اضافہ ہوگا۔ اور مُلک کی

خوشحالی میں افزونی پیدا ہوگی - اب اگر یہ امر صحیح ہے کہ عمل انسانی کے ہلاک کرنے والا یہ گروہ صرف اس اعتقاد و یقین سے پیدا ہوا ہے - کہ جب ہم دست سوال کسی کے آگے دراز کرینگے ہمیں کچھ ملجائیگا - تو کیوں ہمارا ایمان جو دُعا پر ہے - یہی نتیجہ پیدا نہ کرے ؟ اگر مجازی خداوندان نعمت کی جود وسخا پر سائل کے سوال پر محرک ہوکر بیکاری اور گداگری پیدا کرسکتی ہے - تو کیوں حقیقی خدائے نعمت کا ہر ایک کی احتیاج پر اسکی ہر دُعا کو سُن لینا انسان کو عمل سے غافل نہ کردے - ایک گداگر کی طرح کیوں ایک اِنسان محنت کرے - جب خدا اِس طرح سننے کو طیار ہے - بلکہ ایک دہریہ کے نزدیک کسی اِنسان کا کسی کے سوال کو سُن لینا قوت عمل کو اس قدر نقصان نہیں پہنچاتا - جس قدر خدا کے مجیب الدعوات ہونے سے حالت عمل خراب ہوجاتی ہے - کیونکہ کسی اِنسان کے آگے دست سوال دراز کرنا غیرت کا تقاضا نہیں - غیرت بہت لوگوں کو سوال سے روک سکتی ہے - اور انہیں کام پر آمادہ کرسکتی ہے - لیکن خدا سے مانگنا تو بیعزتی نہیں سمجھا گیا - علاوہ ازیں خدا سے تو ہم تنہائی میں بھی کچھ مانگ سکتے ہیں - اس لئے مادیت پرستوں کے نزدیک قبولیت دُعا پر ایمان کسی اِنسان کی داد و دہش پر ایمان سے زیادہ مضر ہے

یہ ایک اعتراض ہے جو مغربی مزاج لوگ ہم قائلین دعاء پر کیا کرتے ہیں۔ یہ ایک مضبوط منطق ہے جس کا جواب ہم پر فرض ہے۔ یا تو ہم دُعاء کو چھوڑیں یا ہم بتلائیں کہ تمدن انسانی کی ترقی کے لئے یہ مسئلہ کہاں تک مفید ثابت ہوگا۔ بظاہر اِس مسئلہ پر ایمان لانا قوت عمل کو کمزور کرتا ہے۔

اِس کا جواب قرآن نے آسان کر دیا ہے۔ اگر ایشیائی ممالک کی بیقاعدگی داد و دہش ضرورت خیرات وصدقات کو معدوم نہیں کرتی۔ نہ زکوٰۃ کو نئے ضرورت کرتی ہے تو پھر دُعاء کا غلط مفہوم اور اُس کا غلط طریق بھی دُعاء کو امر لا حاصل نہیں ٹھیراتا۔ وہ کونسی قوم ہے۔ اور کونسا حصّہ دنیا ہے۔ خواہ وہ دہریت کے ہی زیر اثر کیوں نہ ہو جہاں نسل انسانی کی بہبودی کے لئے خیرات ایک جزو اعظم نہ سمجھی جائے۔ تنگ دستی انسانی سوسائٹی کا ایک ضروری اور لازمی حصّہ ہے۔ اس سے کسی انسانی سوسائٹی کو مفر نہیں۔ اسی کے علاج کے لئے خیرات وصدقات ہر مذہب ملت نے تجویز کئے۔ اگر خیرات وصدقات صحیح طریق پر استعمال ہوں تو پھر جہاں ایک طرف تنگدستی دنیا سے مٹ جائے۔ دوسری طرف گداگری اور بیکاری کا بھی نام ونشان نہ رہے

جیسے کہ ایک حد تک یورپ میں ہو رہا ہے۔ اس کے متعلق جو اسلامی ہدایات ہیں اُس پر مفصل بحث ہم اپنی کتاب

انفاق فی سبیل اللہ

(سوشیلزم اور اسلام)

میں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہی حالت مسئلہ دُعا کی ہے اسلام دُعاء کا دروازہ اُسی پر کھولتا ہے۔ جسمیں ہوسنانہ رنگ ہو و اِلّا وما دعاء الکافرین الا فی ضلال یعنے جس نے کسی امر کے حصُول میں کوئی دقیقہ عمل کا نہ چھوڑا ہو۔ اُسکی دُعاء سُنی جاتی ہے۔ اور جو اپنے قویٰ کو استعمال نہیں کرتا وہ کافر نعمت ہے اسکی دُعا بیسُود ہے۔ اگر اسلام نے گداگری کو بُری طرح سے روکا ہے۔ حتیٰ کہ اس شخص کا روز قیامت میں رُوسیاہ ہونا از رُوئے حدیث ثابت ہے۔ جو اپنی روٹی آپ نہیں کماتا اور اُسکے لئے دست سوال دراز کرتا ہے۔ اور اس لئے خیرات اسلام اُن کے لئے وضع ہُوئی ہے جو کامل کوشش کے بعد بھی کسی ایسے سبب جو اُن کے اختیار سے باہر ہے احتیاج کے شکنجہ میں آجاتے ہیں۔ تو پھر دُعاء بھی انہیں کی تشفّی اور اُن ہی کی دستگیری کے لئے اپنے معجزنما کرشمے دکھلاتی ہے۔ جو کوششوں کو ختم کر چھوڑتے ہیں +

یہاں میں اسی قدر کہتا ہوں۔ کہ بمبئی کے بعض تاجر جو

بڑے بڑے فنڈ خیرات کے رنگ میں چھوڑ کر روزانہ صدہا آوارہ گردوں کی روٹی کا موجب ہو جاتے ہیں۔ صبح و شام ان ننگ اسلام کو روٹی دیکر مسلمانوں کے افلاس کو بڑھاتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ قیامت کے دن میزان عمل ان کے سامنے ہوگا بیشک انکی خیرات میں چند لاکھ روپیہ نیکی کے پلڑے میں ڈالا جائیگا۔ لیکن میزان عمل کے دوسرے پلڑے میں وہ تمام بدمعاشیاں وہ تمام شرارتیں ہونگی جو یہ بیکار اور آوارہ گرد گروہ اس طرح بے محنت روٹی پا کر کرتا ہے۔ اور پھر اُن کی اس بیکاری سے مسلم سوسائٹی کو علے العموم اور اُن کے اپنے خاندان کو بالخصوص جو نقصان پہنچتا ہے۔ سب کے سب ان مخیران بمبئی کی بداعمالی میں ڈالے جائینگے ایک طرف چند لاکھ پلہ خیرات میں ہونگے اور دوسری طرف کروڑوں نہیں اربوں بدیاں دوسرے پلہ میں اس بیکار گروہ کی طفیل چلی جائیں گی۔ اور یہ اسلئے کہ یہ طریق خیرات قرآن نے پسند نہیں کیا۔ جس کے ماتحت اِن تاجران بمبئی کو اگر بقول ہمارے دوست مسٹر حبیب عبداللہ کے گدا گر کہا جائے تو ناموزُوں نہ ہوگا +

قرآن پر مزید غور کرنے سے یہ بات بالبداہت نظر آتی ہے۔ کہ مقبولیت دُعاء سے یہ مُراد نہیں ہوتی کہ کسی مطلوبہ چیز کے حصول کے لئے ہم نے دُعا کی اور وہ مل گئی۔ بلکہ مقبولیت

دُعا سے مراد کسی داعی پر ان راہوں کا کُھلنا یا اس کے راہ میں آسانیوں کا پیدا ہو جانا ہوتا ہے۔ کہ جس پر چلکر اسے منزل مقصود کو پہنچنا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ راہ پر قدم مارتے ہی ایک شخص بذریعۂ دُعا چلنے سے آزاد ہو جائیگا۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ منزل عمل کا راہی چلتے چلتے تھک گیا ہے۔ وہ حیران ہے کہ اب کیا کرے۔ وہاں وہ ایک دروازہ کو پائیگا۔ جسمیں گذرنا اسکو ایک آسان رستہ کی طرف لیجائیگا۔ یہی دروازہ اسلامی دعا ہے۔ لیکن یہ دروازہ میدان عمل کے شروع میں نہیں ہے۔ بلکہ اس میدان میں راہی کی تھکاوٹ پر یہ دروازہ نظر آتا ہے۔ اب اگر دُعا کی یہی حقیقت ہے جو قرآن سے ہمکو منکشف ہوتی ہے۔ تو پھر منکر دُعا غور کرے۔ کہ آیا مسئلہ دُعا اسپ عمل کے سُست ہونے پر مہمیز کا کام دیتا ہے یا اس سے ہلاکت عمل ہوتی ہے۔ وہ دیکھے کہ جہاں ایک مادیت پرست مندرجہ بالا خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہاں ایک قائل دُعا ابریاس کے کناروں پر روشنی کے چمکارے دیکھتا ہے۔ وہ نا اُمید نہیں ہوسکتا۔ خودکشی کی بجائے دعا اسکی ہمت کو اور مضبوط کر دیتی ہے۔ دُعا کے بعد اس کا ہر قدم تیز اور اسکی ہر منزل آسان ہو جاتی ہے۔ اور وہ بہت جلد منزل مقصود کو پہنچ جاتا ہے +

یہ وہ حقیقت ہے جو ہمیں سورۂ فاتحہ کے پڑھنے پر نظر آتی ہے۔ ہم اس سورہ شریف کو جو کہ ایک طرح اُمّ القرآن ہے یعنی کُل تعلیم

قرآن کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے اپنی پانچ وقتوں کی نمازیں کم از کم بتیس دفعہ پڑھتے ہیں یہی عین نماز ہے۔ باقی تو تسبیحات و تکبیرات ہی ہیں۔ اس کے پڑھنے کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اسی کے مطالب کے آگے دوست دشمن مگر قائلین دُعا نے سر جھکایا ہے۔ اسی کو فضلائے دُنیا نے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایک طالب دُعا کی روح کا بہترین اظہار سمجھا ہے۔ اسی کے متعلق ہمیں حکم ہے کہ جو تم دعا کرو ہمیں تمہارا کوئی مقصد اور مطلب ہو تمہاری دُعا کا آغاز سورہ فاتحہ سے ہونا چاہئیے۔ اس تاکید کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف یہ دُعا کسی مقصد اور مطالب کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور دوسری طرف دُعا کرنیوالے کو یہ مقدس الفاظ ان امورِ عالیہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ جن کا ہونا مقبولیتِ دُعا کے لئے ضروری ہے +

دُعا ہو یا درخواست جو ہم خدا کے آگے یا کسی دنیوی قاضی الحاجات کے سامنے لیجاتے ہیں۔ وہ تین مدارج سے خالی نہیں ہوتی۔ ہماری درخواستیں اوّل مخاطب کو ایسے القاب سے مخاطب کرتی ہیں جو ہماری استدعاؤں کے مناسب حال ہو۔ مثلاً بعض وقت ایک ہی حاکم آجکل کی عدالتوں میں۔ دیوانی۔ فوجداری اختیارات رکھتا ہے۔ اگر معاملات فوجداری ہوں تو اس سے مجسٹریٹ کے لقب سے اور اگر دیوانی ہو تو منصف یا جج کہ کر مخاطب کرتے ہیں

درخواست کا دوسرا مرحلہ ہماری استعداد اور ہمارے استحقاق کے اظہار پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم اظہار مطلب کرتے ہیں یہی تین مدارج ہم سورہ فاتحہ میں پاتے ہیں۔ ہم اپنے قاضی الحاجات کو سب سے پہلے رب۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مالک یوم الدین کے خطاب سے مخاطب کرتے ہیں۔ پھر امر مطلوبہ کے متعلق اپنے استحقاق۔ اور قابلیت کو ایاك نعبد وایاك نستعین کے الفاظ میں دکھلاتے ہیں۔ اور اس کے بعد جو چیز ہم مانگتے ہیں۔ وہ صراط مستقیم ہے۔ یعنی حصول مقصد کا آسان سے آسان اور چھوٹے سے چھوٹا راستہ +

یہ ظاہر ہے کہ سائل کے حالات جب تک ان مدارج ثلاثہ کے مناسب و مطابق نہ ہوں۔ کسی کو کسی درخواست کے پیش کرنے کا حق حاصل نہیں ہوا۔ جن القاب سے تم اپنے قاضی الحاجات کو مخاطب کرتے ہو۔ اگر تمہارے حالات ان القاب کے متقاضی نہ ہوں۔ تم کسی دنیوی حاکم کے سامنے نہیں جا سکتے۔ تم نہایت بیکسی اور احتیاج میں خدا تعالےٰ کو صحیح طور پر رب العالمین کہتے ہو۔ یعنی جس نے ہر ایک ایسے عالم کو پیدا اور قائم کر رکھا ہے۔ جس عالم سے تمہاری ضروریات وابستہ ہیں۔ تم اُسے رب کے ساتھ رحمٰن و رحیم بھی پکار کر یہ تسلیم کر لیتے ہو کہ تمہاری ضروریات کے دفعیّہ کے اسباب اور ایسا ہی تمہاری دوسری

ربوبیت کے ذرائع اس نے تمہارے بے مانگے پہلے ہی سے پیدا کر رکھے ہیں۔ پھر ساتھ ہی تسلیم کر لیتے ہو کہ وہ رحیم ہے یعنے جب تک تم ان پیدا کردہ اسباب و ذرائع کو استعمال نہ کرو۔ وہ تمہیں اپنے مزید فضلوں سے مستفید نہ کرے۔ پھر مالك یوم الدین کہکر اس امر کا بھی اعتراف کر لیتے ہو۔ کہ اگر تم نے اسباب رحمانیت کو استعمال نہیں کیا۔ یا انکی بد استعمالی کردی تو تمہارے ان دونوں قسم کے افعال پر مناسب سزا جزا مرتب کر دے۔ خدارا مسلمانوں غور کرو۔ تم نے عملی کیحالت میں کس خدا کو مخاطب کر رہے ہو۔ اُسے ان القاب سے مخاطب کرنے کے بعد تم کس مایہ ناز کو سامنے لیکر اس کے حضور پیش ہوتے ہو۔ تمہیں ہر منٹ بیشک اسکی ربوبیت کی ضرورت ہے لیکن ان اقبالات کے ہوتے ہوئے اگر اُس کے پیدا کردہ اسباب کو عمل میں نہ لاؤ تو خود دُعا کرتے ہو۔ کہ وہ تم کو سزا دے۔ پھر اگر ایک شخص خداداد قوتوں کو یا خداداد اسباب کو جو اس کے اردگرد چاروں طرف موجود ہیں استعمال نہیں کرتا اُس سے بڑھکر اور کون کافرِ نعمت ہے۔ وما دُعاء الکافرین الا فی ضلال کا مصداق اگر وہ نہیں تو اور کون ہے؟ تمہاری دُعاء تمہیں ضلالت کیطرف لیجائیگی۔ ایک یہی حقیقت ہے۔ کیونکہ جو دُعاء کی حقیقت تم سمجھے

ہوئے ہو اُسکے کرتے یا کرانے سے قوت عمل اور کمزور ہوجاتی ہے۔ رہے سہے اسباب حصول مدعا بھی تم چھوڑ دیتے ہو۔ اور اِس طرح الا فی ضلال کا فتویٰ اپنے اوپر صادر کرتے ہو+

اس خدا کی سکھلائی ہوئی درخواست کے دوسرے مرحلہ پر غور کرو۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین (تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں) نماز روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ سے فی نفسہٖ تکمیلِ عبادت نہیں ہوتی۔ یہ تو رُوح عبادت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے حقیقت عبادت فاستقم کما امرت (اُس پر قائم ہو جاؤ جو ہم حکم کرتے ہیں) کے حکم میں محدود ہے۔ تمہارے دُعا کردہ امر کے حصول کے متعلق بھی خدا کا کوئی نہ کوئی امر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تم سعی کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑو۔ اب اگر تم نے حصولِ مدعا میں خدا کے اوامر کی پرواہ نہیں کی۔ تو کیا تم ایاک نعبد کہنے کے مستحق ہو؟ امر مطلوبہ کے متعلق تم اسی وقت ایاک نعبد کہہ سکتے ہو۔ جب اس کے حصول میں تم نے اپنی کُلّی کوششیں ختم کرلیں۔ ایک دُنیوی حاکم کے سامنے کسی امر کے حصول میں اگر تم مشروط قابلیت کو غلط طور پر بیان کرو۔ تو اگر تمہاری درخواست حلف سے مئوکّد ہے۔ تو اس غلط بیانی پر

تم دروغ حلفی کے ماتحت جہنّم داصل ہوتے ہو۔ تو پھر کیا۔ تم نے خدا کی جناب خالہ جی کا گھر سمجھ رکھا ہے۔ کہ ہر وقت اُسکی جناب میں جاؤ۔ اور نہایت خیرہ چشمی سے ایاک نعبد کا استحقاق جھوٹے طور سے پیش کرو۔ پھر صرف یہ ہی نہیں تم ایاک نستعین کہہ کر ایک اور غلط بیانی کر گذرتے ہو +

عربی زبان نے اعانت اور امداد میں کچھ فرق کیا ہے یہاں ہم استمداد نہیں بلکہ استعانت کرتے ہیں۔ امداد کسی چیز کے بڑھانے میں ہوتی ہے۔ اعانت کسی کمی کے پورا کرنے میں ہوتی ہے۔ یعنی استعانت میں تم یہ ظاہر کرتے ہو کہ ہمارے پاس جو کچھ پہلے ہے وہ حصول مُدّعا کے لئے کافی نہیں۔ جس شخص نے دی ہوئی طاقتوں یا اسباب کو استعمال ہی نہیں کیا۔ وہ کس مُنہ سے کہہ سکتا ہے۔ کہ موجود اسباب حصول مُدّعاء کے لئے کافی نہیں۔ ایاک نستعین وہ ہی کہہ سکتا ہے۔ جس نے سعی و کوشش کے بعد اپنی کمیوں کو محسوس کر لیا ہے۔ وہ اپنی طاقتوں کو بعد از استعمال ناکافی پاکر جو یندہ اعانت ہوا ہے۔ اب تم خود ہی فیصلہ کرو۔ کہ تمہاری درخواست کا وہ حصہ جسمیں تمہیں اپنے استحقاق کا ذکر کرنا تھا صحیح ہے یا غلط؟ یہ رحم خداوندی ہے کہ وہ تمہاری دروغ حلفیوں پر دُنیوی عدالتوں کی طرح تمہیں سزا

نہیں دیتا۔ ہاں فی ضلال کا حکم تمہارے لئے کتاب حمید میں موجود ہے +

اب تم اپنی درخواست کے تیسرے درجہ میں اپنی طلب کردہ چیز پر غور کرو۔ تم یہ تو نہیں کہتے کہ جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے۔ وہ بنی بنائی ہمیں دیدے۔ تم تو اھدنا الصراط المستقیم کہکر یہ عرض کرتے ہو کہ ہم تو حصول مراد کی ساری راہوں پر چل نکلے۔ مولیٰ کریم اب تم کوئی آسان سے آسان راہ دکھلادو۔ مستقیم اس چھوٹے سے چھوٹے خط کو کہتے ہیں جو دو نقطوں میں بطور واصلہ ہوتا ہے۔ ایک نقطہ پر تم کھڑے ہو۔ دوسرا نقطہ تمہاری منزل مراد ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے سینکڑوں راستے ہیں۔ تم چھوٹے سے چھوٹے راستہ کی طلب میں ہو۔ یہ تو تمہارا مطالبہ نہیں۔ کہ تم بلا قدم ہلائے بیٹھے بٹھائے وہاں پہنچ جاؤ۔ پھر تم نے اس دعاء میں اس بتلائے ہوئے راستہ پر چلنے کا اس قدر اشتیاق ظاہر کیا ہے کہ تم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین بھی کہ جاتے ہو۔ یعنی ہم اس جماعت میں سے نہ ہوں جو بتلائے ہوئے راہ کی پرواہ نہ کرکے مغضوب ہو جاتے ہیں۔ اور نہ انہیں سے ہوں جو گمراہ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ صراط الذین انعمت علیھم

یعنی وہ راہ جس پر کامیاب لوگ چلیں تمہیں کامیابی کو مانگنا نہیں سکھلایا گیا۔ تمہیں کامیابی کی راہ کو پانے کے لئے دُعا کا حکم ہے۔ تم تو صرف ہدایت راہ پر اور پھر اس پر صحیح طریق سے چلنے کی توفیق مانگتے ہو۔ سوچو غور کرو۔ تم دُعا کیا کرتے ہو اور تمہارا عمل کیا ہے +

خدا بیشک قادرِ مطلق ہے۔ وہ بیشک ربّ العٰلمین ہے۔ جس خدا نے اپنی شان رحمانیّت میں تمہیں بن مانگے رحمت دے رکھی ہے۔ تمہاری ضروریات کے سامان پیدا ہونے سے پہلے دفع ضروریات کے اسباب پیدا کر رکھے ہیں وہ بیشک طاقت رکھتا ہے۔ کہ تمہیں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے بھی روٹی دے۔ وہ درختوں کو چلنے پھرنے کی تکلیف نہیں دیتا۔ جہاں وہ کھڑے ہیں رہیں ان کا آذوقہ اُنہیں پہنچا دیتا ہے۔ وہ تو پتھر میں کیڑے کو رزق دیتا ہے وہ بالضرور تم سے بھی ایسا ہی معاملہ کریگا۔ ہاں کچھ تھوڑی سی بات کی ضرورت ہے۔ وہ تم کرلو۔ خلعت انسانیت کو اُتار کر پتھر کے کیڑے بن جاؤ۔ شرافت مردمیّت کو گنوا کر عالم جمود میں چلے جاؤ۔ بلا محنت روٹی ملیگی۔ اور یہ شاید تمہارے لئے مشکل ہی نہیں۔ کیونکہ اس وقت بھی تمہیں انسانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ تم اگر انسان ہوتے تو لیس للانسان

والا ما سعی کے مصداق ہوتے +

ہیہات حسرت - اور حسرت پر حسرت - خاص کر مجھ جیسے انسان کے لئے جو رات دن مختلف مذاہب کی تعلیمات کا مقابلہ کرتا ہے - جو ہر مسئلہ اور صداقت مذہبی پر مختلف معلمین کے ارشادات پر غور کرتا ہے - جیسے مختلف سوسائٹیوں کے تمدن اور ان کے طریق اخلاق کو قرآنی تمدن و اخلاق کے مقابل میں لاکر اپنے مد مقابل کو قائل کرتا ہے - گذشتہ ایام جنگ میں جب مذہبی چرچا مقابلتہً کم تھا میری فرصت اسی غور و فکر میں خرچ ہوئی - جس نتیجہ پر میں پہنچا وہ میرے دل کو خون کردینے کے لئے کافی سے بھی زیادہ تھا - میری گذشتہ بیماری کا موجب جس کے تاثرات سے میں ابھی کامل طور سے نہیں نکلا (اس کتاب کے پڑھنے والے میری صحت کامل کے لئے اللہ دعا فرمائیں) وہ مطالعہ کی محنت شاقہ نہ تھی - بلکہ مطالعہ سے جس رنج و غم کا میں شکار ہوا - اس نے میرے دماغی اعصاب پر حملہ کیا - اور وہ یہ تھا - کہ ہر ایک مسئلہ اور اصول میں جو انسان کے کسی شاخ عمل کے لئے ضروری ہے اُن کے متعلق بہتر سے بہتر تعلیم اسلام نے دی متمدن قوموں نے اپنے مذہب اور اپنی سوسائٹی کی تعلیمات کو چھوڑ کر انہیں اختیار کر لیا - لیکن مسلمانوں نے اپنے گھر کی باتوں کو چھوڑ کر ان امور کو لیلیا جو ان ترقی کرنیوالی قوموں

کے مذہب نے تو انہیں سکھلائے تھے لیکن جنہیں انھوں نے خود غلط سمجھ کر چھوڑ دیا ۔

اِس میری تحقیق کے ماتحت مسئلہ دُعا بھی آتا ہے۔ اور ایسا ہی اور تعلیمات جو روزی کمانے اور اسباب عزّت و معاشرت حاصل کرنے کے متعلق انجیل اور قرآن میں پائی جاتی ہیں مثلاً جس دُعائے مسیح پر آج کلیسیہ کو ناز ہے۔ اس پر اُن کا عمل نہیں وہ قرآنی دُعا پر عامل ہیں ۔ اُن کے مقابل مسلمان خدا کی تعلیم دادہ دُعاء کی منشاء پر نہیں چلتے ۔ اور عملاً مسیحی دُعاء کے قائل ہیں ۔ جہاں جناب مسیح خدا کی ستائش و تقدیس کے بعد دعاء یہ کہتے ہیں ۔ کہ

"ہمیں آج کے دن کی روٹی دے"

وہاں قرآن روٹی کمانے کا صحیح راستہ سیکھنے کی دُعاء سکھلاتا ہے، یعنے اھدنا الصراط المستقیم کیا قسمت کا اُلٹ پھیر ہے ؟ عیسائی عملاً مسلمان اور مسلمان اپنے عمل سے عیسویت کے پیرو ہیں مسیحی اُن راہوں کی تلاش میں ہیں جو روٹی کمانے کے لئے آسان سے آسان ہیں ۔ اور مسلمان اُن راہوں پر چلنا نہیں چاہتے ۔ ہاں پکی پکائی روٹی کے مالک بننا چاہتے ہیں ۔ پھر تم مسلمان نہ رہو عیسائی ہی بن جاؤ تو اچھا ہے لیکن وہاں بھی مشکل ہے عیسائیوں نے چودہ پندرہ صدی

تک مسیح کی دعاء پر عمل کیا - اور تمہاری طرح یہی یقین کرتے رہے کہ صرف دعائیہ الفاظ زبان پر لانے سے مقصد حاصل ہو جایا کرتا ہے وہ ایسا کرنے میں حق بجانب بھی تھے کیونکہ مسیح کے دعائیہ الفاظ بھی ایسے ہی تھے۔ آخر تجربہ نے ان پر اس قسم کی دعاء کے سود ثابت کردی ۔ انہیں اھدنا الصراط المستقیم کی ہی دعاء صحیح سمجھ آئی

مصیبت یہ ہے کہ ہم اپنی نمازیں اور اپنی دعائیں طوطے کیطرح رٹتے ہیں - ہم نہیں سمجھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں - اس کتاب کے پڑھنے والوں کی خدمت میں میری ایک عرض ہے - وہ میری ان معروضات بالا کے پڑھنے کے بعد جو پہلی نماز پڑھیں اور ضرور ہے - کہ ان کے سامنے کوئی کام کوئی مشکل کوئی ضرورت ہو گی - وہ اسے بھی سامنے رکھیں اور یہ خیال کرلیں - کہ وہ سورہ فاتحہ پڑھ کر وہ کوئی قرآنی فقرے بلغرض ثواب نہیں دہرا رہے بلکہ خدا کے سامنے یہ کہ رہے ہیں +

اے اللہ تو رب العالمین ہے - تو ہماری ربوبیت ضرور کریگا - تونے میری غرض پیش آمدہ کے دفعیہ کے اسباب بیشک پیدا کر رکھے ہیں کیونکہ تو رحمٰن ہے - تیری شان رحیمیت کی بھی ہے - جس وقت میں ان اسباب کو استعمال کرونگا - میرے ہر ایک عمل کا عوض تو کئی گنا ضرور دیگا - اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیرا افضل رحیمیت میرے عمل کے بغیر نہیں ہو گا - اور نہ یہ بھی میں جانتا ہوں کہ تو مالک

یوم الدین" ہے بدعملی یا نیک عملی کی جزا سزا مرتب کرنے کا بھی تو
مالک ہے۔ ایاک نعبد میں نے تو اپنی طرف سے اس امر
پیش آمدہ کے حصول کے لئے تیرے حکم کردہ ادامر کو اختیار کر لیا ہے اور
اس امر میں کسی اور کی طرف نہیں گیا۔ ایاک نستعین میں نے
تو اپنی طرف سے کوئی دقیقہ چھوڑا نہیں۔ اب میں اپنے نقصوں
کو محسوس کرتا ہوں۔ یہی وقت اعانت ہے۔ اور اعانت بھی کس بات
کی مانگتا ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی۔ کہ قدم کس طرف اٹھاؤں حصول
مراد کیلئے مجھے کوئی آسان راستہ بتلا دے جس پر چلکر فائز المرام
ہو جاؤں ... وغیرہ وغیرہ ... +

مسلمانو! کیا دُعاء اس رنگ میں مانگا کرتے ہو۔ تم ایکدفعہ
ان مطالب کو سامنے رکھ کر دُعاء کرو۔ ان الفاظ کے مطالبات کو پُورا
کرنے کے بعد حرف دُعاء زبان پر لاؤ۔ پھر دیکھو مقبولیت دُعاء
سایہ کی طرح تمہارے پیچھے آتی ہے یا نہیں۔ یاد رکھو کہ جن
لفظوں میں دوسرے مقام پر خدا تعالےٰ نے دُعا کی مقبولیت
کی خوشخبری دی۔ وہ یہ ہے۔ انی قریبٌ اجیب دعوۃ
الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی و لیومنوا لی لعلھم
یرشدون۔ میں قریب ہوں۔ دعا کرنیوالے کی دُعاء سُنتا
ہوں۔ جب کوئی دُعاء کرے۔ وہ مقبولیت دُعا کے لئے دست طلب
اُٹھائیں۔ مومنانہ شان پیدا کریں۔ تو ہم راہ دکھلا دینگے۔

خدارا اس مژدہ میں دو لفظوں کو مت بھولنا - ایک لیومنوابی یعنے مومن بنتا اور وہ عمل کو چاہتا ہے - دوسرا یرسٹ دن - تمہیں راستہ دکھلایا جائیگا چلنا تمہیں ہے - گویا قبولیت دعا یہ ہے کہ تمہیں امر مطلوبہ کے حصول کا راستہ نظر آئے کوشش تمہارے ذمے ہے +

الغرض قرآنی دعاء کا مقصد اور اس کا محل وہ امداد غیبی ہے جو میدان عمل میں ہر مرحلہ مشکل پر قدم اٹھانیوالے کی ہادی راہ ہو جاتی ہے - خالق اسباب ایک ہاتھ پاؤں ہلانے والے کیلئے ذرائع پیدا کر دیتا ہے - تاکہ اس کے عمل ضائع نہوں - اسمیں شان قدیری پر کوئی حرف نہیں آتا عدم سے ہستی میں لانیوالے خدا نے ہمارے قوی کی آبیاری کے لئے یہ ہی پسند کیا - وہ بچہ جو ایک اہل ثروت کے گھر میں پیدا ہوا ہے جہاں گھوڑا گاڑی موٹر سب موجود ہے اس کے قوی کی نمو کے لئے اس کے والدین اگر عقلمند ہیں تو یہ پسند کرینگے - کہ وہ زیادہ حصہ اپنے اوقات میں چلے پھرے - اپنے پاؤں اور ٹانگوں کا استعمال کرے - وہ اگر چاہیں تو اس بچہ کو زمین پر قدم بھی نہ رکھنے دیں لیکن یہ ناز پروردگی اسے اپاہج کر دیگی - خدائتعالیٰ تو ایک انسان سے کہیں بہت زیادہ ہمارے مفاد کو سمجھتا ہے - اور اسکی خوشی

بھی یہی ہے کہ ہم انہیں حاصل کرلیں۔ خود لفظ دُعاء بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے۔ دُعاء کے معنی جہاں ایک طرف مانگنے کے ہیں۔ وہاں کسی کو اپنی طرف بُلانا متوجہ کرنا۔ یا دعوت دینا ہے۔ ہم نے خدا کو اسکی صفات سے پہچانا ہم اسے بعض ناموں کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں۔ دُعاء دراصل کیا ہے؟ اُن اسباب کو اپنی طرف پھیرنا جو ربوبیت عامہ نے مختلف ضروریات کے دفعیہ کے لئے پیدا کر رکھے ہیں۔ ہم اگر اپنی دُعاء میں خدا کو اسکے کسی نام سے پکارتے ہیں۔ تو دراصل اسکی اُس صفت کو اپنی طرف بُلاتے ہیں! اسکے مختصہ فیض کے تلے آنا چاہتے ہیں۔ پھر اگر یہ صورت ہے، اور دُعاء کے کوئی معنے لو۔ وہ اس حقیقت سے باہر نہ ہونگے تو پھر دفع ضرورت کے لئے خالق اسباب کو پکارنا اور اسکے پہلے ہی سے پیدا شدہ اسباب سے تمسک نہ کرنا یہ ایک مضحکہ ہے اور ہرزہ درائی ہے +

دُعاء کی اس حقیقت کو اگر ہم سمجھ لیں تو وہ اعتراض بھی دفع ہوجاتا ہے کہ دُعاء کرنیکی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب دُنیا میں اسباب موجود ہیں۔ اُن سے ہم تمسک کرلیں گے۔ وہ یہ یاد رکھیں کہ اگر وہ اسباب بھی خدا کے ہی پیدا کردہ ہیں تو دُعاء کی طرف پہلا قدم اور دراصل صحیح قدم اُنہیں پیدا شدہ اسباب سے

تمسک کرنا ہے - ایک مومن اسباب ضروریہ کے لئے خدا کی جانب ہاتھ اُٹھانے سے پہلے اسباب موجودہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے معلومہ اسباب کا مطلوبہ نتیجہ پیدا کرنا بھی تو خدا ہی کے اختیار میں ہے - ہم کبھی وثوق سے کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرسکتے بعض بیماریوں کے علاج میں معلومہ مجربہ ادویات بھی مفید نہیں پڑتیں - کیونکہ نقص علم کے باعث کسی مصیبت یا تکلیف کا علاج کافی ہمیں معلوم نہیں ہوتا - اگر یہ علاج بھی خدا کے ہی بنائے ہوئے ہیں - اور ان میں تاثیروں کا رکھنا اور وقت پر ان تاثیرات کا اپنا عمل دکھلانا بھی خدا کے ہاتھ میں ہے - تو پھر تم اُس علاج کو اختیار کرکے اور کیا کرتے ہو خدا کی اس طاقت کو اپنی طرف بلاتے ہو جس کے ساتھ وہ تاثیر علاج کو ظہور میں لاتا ہے - ہاں ایک مادہ پرست سے ایک مومن کی حالت دحیثیت بدرجہا بہتر ہے - اوّل الذکر معلومہ علاج کے تاثیر نہ دینے پر رہین یاس ہو جاتا ہے - اور یہ وہ بات ہے جو آئے دن تجربہ میں آتی ہے - اس موقعہ پر مومن کو کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی - اُس کی تلاش وجستجو دُعاء کی صورت میں یا اپنے ماحول پر مزید غور کرنے میں لگی رہتی ہے ؂

آخر دُعاء ایک استمداد واستعانت ہے - تم ایک سپاہی سے علاج مرض میں طلب امداد نہیں کرسکتے - اور نہ فوج

دشمن کے مقابلہ کیلئے ایک طبیب کی طرف تم دیکھ سکتے ہو۔ تو پھر تم
کس طرح خدا تعالیٰ کی جناب میں اسکی صفات کے تقاضات
سے باہر جا سکتے ہو۔ قرآن کریم کی بیان کردہ صفات کو
چھوڑ دو جس نے خدا کی ننانوے صفات مندرجہ کیلئے ان
چار صفات یعنی ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالکیت
کو بطور اُم تجویز کیا ہے۔ تم صحیفۂ قدرت سے خالق کائنات کا
پتہ لگاؤ۔ اور ان صفات کو تعقل میں لاؤ۔ جس پر ذرات
عالم اپنی خلق و نمو کی روشنی میں تمہیں اپنے خالق کا پتہ
دیں تو تمہیں ذرات چھوڑ سالمات تک یہ شہادت دینگے
کہ اس کائنات کا بنانے اور چلانیوالا قوانین کے مطابق کام
کرتا ہے۔ اور اس کے سارے کے سارے قوانین پر جو چار
قوانین حاوی ہیں۔ وہ قانون ربوبیت۔ قانون رحمانیت
رحیمیت اور مالکیت ہیں۔ پھر اگر یہ صورت ہے تو پھر تمہاری
مدد بھی اُن ہی صفات کے ماتحت ہوگی۔ ہاں اس قادر
مطلق خدا کا ایک اور رنگ بھی ہے۔ وہ اپنی شانِ مالکیت
میں اپنے قانونوں کا بھی مالک ہے۔ اور اُن پر غالب ہے۔
وہ چاہے تو اُن سب قوانین کو چھوڑ کر اپنی قدرت کی جلوہ
نمائیاں دکھلائے۔ اور یہ وہ ایمان ہے۔ جو شانِ خداوندی
کے ہی شایاں ہے بلکہ قرآن نے ایسے خدا کا پتہ بھی دیا ہے۔ واللہ

غالب علیٰ امرہٖ یعنی خدا اپنے قوانین پر بھی غالب ہے۔ اس ایمان کے ساتھ خدا کی حیثیت ایک کل چلانیوالے کی حیثیت نہیں رہتی۔ جیسے کہ ایک دہریہ اعتراض کرسکتا ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جو نازک سے نازک وقتوں میں ظاہر ہوئی ہے خود تاریخ عالم بھی ایسے واقعات کی شاہد ہے لیکن انسان کی حقیقی تربیت کے لئے اور اس میں قوت عمل بڑھانے اور قوانین الٰہیہ کی عزت کا احساس اسمیں پیدا کرنے کیلئے اس قادر مطلق نے انداز و محل بھی مقرر کر رکھے ہیں جیسے کہ قرآن ایک اور مقام پر اشارہ کرتا ہے قد جعل اللہ لکل شئ قدرا - اللہ تعالیٰ نے ہر ایک شئے کا اندازہ اس کا محل وقوع و ظہور مقرر کر رکھا ہے۔ اس محل وقوع کا ذکر بھی اسی جگہ ان مقدس الفاظ سے پہلے موجود ہے۔ جیسے کہ فرماتا ہے:-

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شئ قدرا۔

جو خدا کی نگاہ میں متقی ہوتے ہیں۔ ان کے ایسے وقت میں جب مصائب اور مشکلات سے نکلنے کا کوئی راہ نظر نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کی جناب سے انکے لئے مخلصی کی راہ نکال

دیجاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور اسکی بخششیں اُن کے پاس ایسے اطراف سے آجاتی ہیں جہاں ان کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ جو خدا پر توکّل کرے۔ کیوں خدا اس کے ساتھ نہ ہو جائے اس کا حامی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح اپنے امر پہنچ جاتا ہے اس کے یہاں اس کا بھی ایک انداز ہے۔ کیونکہ اس نے ہر امر کے ظہور کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ یہ وہ نفولیل جاں بخش ہے کہ جس پر عاشقانِ الٰہی جیتے ہیں مصیبت کے زلزلے آتے ہیں۔ یاس و نا اُمیدی ہر طرف سے گھیرتی ہے۔ حتّٰے کہ اولوالعزم سے اولوالعزم انسان بھی گھبرا کر شفقت کے آخری کنارہ پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ آنکھیں آسمان کو تکے ہوئے دل ہی دل میں یہ کہتے ہیں۔ متیٰ نصر اللہ خدا کی مدد کہاں ہے۔ کب آئیگی۔ ع

بس اندا تکہ من تمام بجہ کار خدا کی مدد

الا ان نصر اللہ قریب۔ گھبراؤ نہیں وہ دیکھو مدد آئی؟ یہ ایک صداقت ہے لیکن یہ وہ نہیں کہ جس پر کوئی اُدھار کھا بیٹھے جیسے آجکل کے مسلمان کر رہے ہیں۔ یہ نعمت ما دشما کے حصہ میں نہیں آتی۔ اس کا محل ضرور ومن یتق اللہ ہے یہ نصرتِ خداوندی جس قیمت کو چاہتی ہے۔ اس کا نام قرآن نے تقوےٰ رکھا ہے۔ جس کا انداز ہر انسان کی حالت اور ضرورت

کے مطابق ہوتا ہے۔ اسکی ایک ادنےٰ شان یہ ہے۔ کہ انسان نے کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ جو شخص کسی امر میں سعی نہیں کرتا۔ وہ متقی نہیں۔ اس لئے آیت بالا کا وعدہ بھی اسکے ہی حق میں ہے جو اپنی طرف سے کوئی فرق نہیں کرتا +

مسلمانوں پر بھی آج یہی وقت ہے۔ اُن کی اضطرابی حرکات بھی زبانِ حال سے متی نصر اللہ پکار رہی ہیں۔ اُن میں سے اکثر اس نصرت سے مایوس بھی ہو چکے ہیں۔ اور میرے نزدیک انہیں مایوس ہی ہونا چاہئے۔ جب ہم لباسِ تقوےٰ سے مُعرّا ہو چکے ہیں۔ تو ہم اس نصرت کو کس طرح اپنی طرف بلا سکتے ہیں۔ یجعل لہٗ مخرجاً کا مژدہ تو متقیوں کو دیا گیا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تقویٰ کی راہیں ہمارے سامنے کھلی ہیں۔ یہ کوئی معمّہ لاینحل نہیں۔ قرآن نے کھول کھول کر امورِ تقویٰ بیان کئے ہیں۔ بعض معیار بتلائے ہیں۔ جن سے انسان اپنے قول و فعل کو جانچ سکتا ہے۔ کہ کہیں وہ تقوےٰ سے تو باہر نہیں۔ آج تقوےٰ اختیار کرو پھر جو چاہو حاصل کر لو +

اے ممبر نشین بزرگو للہ کچھ تقویٰ کی تشریح سے ہم مسلمانوں کو آگاہ کرو۔ آپ اپنے وعظوں میں جہاں بیسیوں دفعہ

تقویٰ کرو تقویٰ کرو فرمایا کرتے ہو - آپ ہمیں اب رموزِ مذہب سے ناواقف سمجھیں - آپ اپنے وعظوں میں ان امور کو کھول کھول کر بتلائیں جن کا نام تقوےٰ ہے - یقین جانو ہمیں اب تقوے کے معنے بھی نہیں آتے - آپ مسلمانوں کو قرآن و حدیث سے دکھلائیں - کہ جو شخص سنِ بلوغ کے بعد اپنی روزی آپ نہیں کماتا وہ مُتّقی نہیں - جو باپ کا ایک معقول ترکہ پاکر اپاہجوں کی طرح بیٹھ جاتا ہے اور اُسے کھا جاتا ہے وہ متقی نہیں - جو کسی امر مطلوبہ کے حاصل کرنے کے لئے خود کوشش نہیں کرتا - اور ادھر اُدھر دوسروں کی طرف دیکھتا ہے وہ متقی نہیں ہے - جو خداداد قوتوں کو اور ربّانی عطیات کو دوسروں کے فائدہ میں استعمال نہیں کرتا وہ متقی نہیں ہے جو قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو مقدم کرتا ہے وہ متقی نہیں ہے جس کی خانگی معاشرت اچھّی نہیں - جو اپنے خویش و اقارب سے بدسلوکی کرتا ہے صلۂ رحم نہیں جانتا یتیموں کی جائداد پر نگاہ رکھتا ہے وہ متقی نہیں ہے - اسکی نمازیں اس کی عبادات مشہورہ بھی بیفائدہ ہیں (فویل للمصلین) الغرض جو ہر شعبۂ زندگی میں جائز طریقوں کو استعمال کرکے اس میں ایک اعلےٰ نمونہ دکھلانے کا ارادہ نہیں رکھتا - اور اسکی طرف اپنی جانب سے قدم نہیں اُٹھاتا وہ شانِ اتقاء سے

ناواقف ہے +

میں خیال کرتا ہوں - کہ میں نے مسئلۂ دُعا کے متعلق اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کر دیا ہے - مسئلۂ تقدیر کی طرح مسئلۂ دُعا بھی انسان کی قوّتِ عمل کو آٹھوں پہر تحرّک میں رکھنے کے لئے تعلیم کیا گیا تھا - لیکن وا رے قسمت - یہی دو مسئلے ہمارے لئے مانعِ ترقی ہو گئے ہیں - ہم نے خُدا پر کامل ایمان کا یہ ثبوت دینا شروع کیا ہے - کہ ہمیں کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں - جس وقت ہم اس سے مانگیں گے وہ ہمیں مُنہ مانگی مُراد دیگا - ہاتھ اُٹھانے کی ہی دیر ہے اللہ میاں ہمیں ہماری مُراد دیدینگے - کام کرنا محنت کرتے کرتے مرجانا - کمیِ اعتقاد و ایمان کا ثبوت دینا ہے - دعا کی ہے - اللہ فضل کر دیگا +

شاید ایسا ہی ہو لیکن جہانتک ہم نے قرآن کو دیکھا ہے جہاں تک سیرتِ نبوی اور دیگر صُلحاء کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے ہمیں تو یہی نظر آتا ہے کہ خدا تعالیٰ تمہاری من مانی مُرادیں تو ایک طرف اپنے وعدہ کردہ افضال کے درُود سے پہلے یہ دیکھ لیتا ہے - کہ اس کے موردِ فضل انسان نے حصُول فضل میں تو اپنی طرف سے کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا - جب وہ دیکھتا ہے - کہ انسان اپنی کوششوں میں مر مٹا - اس وقت اُس کے

وعدہ کردہ فضل آتے ہیں ۔ اس حقیقت کو سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں بابوصاحت کھولا گیا ہے ۔ عدم گنجائش کے باعث میں اس کا صرف حصہ متعلقہ یہاں نقل کر دیتا ہوں ورنہ اس کے اندر پہلو بہ پہلو تمدن اور ایمان کی راہیں درج ہیں جن کے چھوڑنے پر انسان اس خزی الدنیا میں پڑتا ہے جہاں اس کا کوئی انصار نہیں ہوتا ۔ یہی قریب قریب حالت ہماری ہے ۔ اب میں آیات محولہ نقل کرتا ہوں :-

ربنا واتنا ما وعدتنا علیٰ رسلك ولا تخزنا یوم القیامة ‌ؕ انّك لا تخلف المیعاد ہ فاستجاب لهم ربهم انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی بعضکم من بعض ج فالذین هاجروا واخرجوا من دیارهم واوذوا فی سبیلی وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنهم سیاتهم ولادخلنهم جنّٰت تجری من تحتها الانهار ج ثوابًا من عند الله والله عنده حسن الثواب ہ

ترجمہ ۔ اے ہمارے مولیٰ ہمیں وہ عطا کرتے جس کا اپنے رسول کی معرفت تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے ہمیں قیامت کے دن ذلیل نہ کیجیو بیشک تو اپنے وعدوں کو پورا کرتا ہے ۔ سو اُن کے ربّ نے انکی دعا قبول کی تم میں سے مرد ہو یا عورت عمل کرنیوالوں کے عمل کو ضائع نہیں کیا کرتا لہٰذا جنھوں نے ہجرت کی اور وطن سے نکالے گئے میری راہ میں

تکلیفیں سہیں - لڑے قتل کئے گئے - میں ضرور اُن کے ذلزب کو
دبا دونگا - وہ (کامیابی کے) باغوں میں داخل ہونگے - جن کے نیچے
نہریں چلتی ہیں - یہ اللہ کی طرف سے اُن کو عوضہ ہے - اور یہ بہترین بدلا ہے
اب مسلمان خود ہی غور کر لیں - کوئی خدا کو وعدہ یاد دلاتا ہے
جناب باری ایفائے وعدہ کیلئے تیاری بھی ظاہر کرتے ہیں اور
وجہ ایفائے وعدہ جو بتلاتے ہیں - وہ پھر وعدہ یاد دلانے والوں
کا عمل ہی عمل ہے - اور جس طرح یہ وعدہ پورا ہوا ہے - وہ بھی
قابلِ غور ہے مسلمان دیکھیں کہ صحابہؓ جن کی طرف اشارہ
ان آیات میں ہے کس طرح کامیابی پر پہنچے +
آج ہماری بدعملی اور بے عملی نے ایک محشر میں ہمیں
کھڑا کر رکھا ہے جہاں ہمارے ہاتھوں کی پیدا کردہ ذلت و
رسوائی ہمارے ارد گرد کھڑی ہے - ہم سے جو کچھ کسی نے
چھینا ہے - وہ کلیتہً کسی دوسرے کے دستبرد کا نتیجہ نہیں
ہم آج سے کئی سال پہلے ان اسباب کو اپنے اندر پیدا کر چکے
تھے جن سے انسان اپنی مکسوبہ چیزیں خود اپنے ہاتھوں
گنوا بیٹھتا ہے - دوسرے کی طاقت ہماری کمزوری کا نام ہے
ہم نے کمزور ہونے میں تقدیم کی دوسرا لازماً طاقت پا گیا - ہم
ہیں وہ باتیں ایک عرصہ سے پیدا ہو چکی ہیں جن پر خدا
کے اختیارات محولہ الفاظ توتی الملک من تشاء

وتنزع الملك ممن تشاء حرکت میں آجاتے ہیں کسی کا غصب کیا اور کسی کی بدعہدی کیا۔ تم خدا کی جناب میں اپنے آپ کو جہانبانی کے قابل بناؤ۔ حکومت تو تمہارے اعمال کا ایک صلہ ہے جو خدا کی طرف سے عاملین کو ملا کرتا ہے +

آج تم میں کچھ احساسِ مصیبت ہوا ہے۔ سوتے ہوئے اچانک کسی خوف سے جاگ اُٹھے ہو۔ لیکن ہوش کرو۔ تمہارے موجودہ افعال کسی ایسے ہی خواب سے اُٹھنے والے کی حرکات نہ ہوں۔ جنمیں سراسیمگی اور وحشت ہوتی ہے جس کا ہر قدم اُلٹا اور ہر فعل بے سُود ہی نہیں۔ بلکہ مضر بھی ثابت ہوتا ہے۔ میرا مقصد صرف اسی قدر ہے۔ کہ ہمیں اس وقت نہایت ہی حزم و احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ فی الجملہ ہمیں وہی کرنا چاہئے جس کی ہدایت ہمیں قرآن دے۔ مثلاً اس عدم تعاون کے مسئلہ میں جو آج تم نے اختیار کر رکھا ہے قرآن کو سامنے رکھو۔ اس کا وہی پہلو اختیار کرو۔ جس کی اجازت صریح الفاظ میں قرآن دے۔ اور اِس بات کو خدارا ایک لمحہ کے لئے نہ بھولو کہ ہمارے اور ہندوؤں کے حالات یکساں نہیں۔ ممکن ہے جو اُن کے لئے دوا ہو وہ ہمارے لئے زہر ہو جائے +

فدیہ۔ کفّارہ۔ سفارش۔ وسیلہ

جس خُدائیتعالیٰ نے ہر قسم کی قُدرت کے ہوتے ہوئے بھی یہی پسند کیا ہے کہ جو بوئے وہ کاٹے۔ جو تلاش کرے وہ پائے۔ جس ذُوالمنن خُدا نے اُس پر بھی کہ اسکے خزانے ہر لمحہ کی بیشمار دادودہش پر بھی نہیں گھٹنے یہ نہیں پسند کیا کہ اس کے فیض رحمانیّت کے بعد کوئی بے عمل اُن خزائن سے کچھ لے سکے۔ وہ خُدا کس طرح پسند کریگا۔ کہ کسی بے عمل کو کسی فدیہ۔ کفّارہ یا سفارش پر کچھ دیدے۔ اُس کا ایسا کرنا تو اُس کے اپنے اعلان کردہ دستورُالعمل کے خلاف ہوگا۔ حالانکہ وہ ولن تجد لسنتہ اللہ تبدیلا (تم خُدا کے طریق اور راہوں میں کبھی بھی تبدیلی نہ پاؤ گے) کا اعلان دے رہا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک طرف وہ عمل پر زور دے۔ اپنے محبوب ترین انسانوں کو کارزارِ عمل کا شہید بنائے۔ اور دُنیا کے بے فکروں اپاہجوں اور بدکاروں کو اُن کی بے عملی اور بدعملی پر بھی کسی فدیہ کفارہ یا سفارش پر مطلوبہ ثمرات عطا کردے + یہ سُنّتِ خُداوندی اس لئے ظہور میں آئی کہ انسان کے قوئے مسلوب نہ ہو جائیں۔ بلکہ اس کی قوتیں حرکت

ہیں آکر ودیعت شدہ کمالات کو ظاہر کریں تمہارے
عمل کے صلہ میں کسی چیز کا عطا کرنا اسلئے نہیں ہوتا کہ تمہارے
عملوں کی خدا کو ضرورت ہے یا خزائنِ ربّی میں کمی ہے بلکہ اس
مصلحت ربی کی منشاء نو تحریک قوئی مضمرہ ہے۔ کیا تم نے قرآن
میں نہیں پڑھا و من جاھد فانما یجاھد لنفسہ ان اللہ لغنیّ
عن العالمین۔ جو کوشش کرتا ہے وہ اپنے نفس کیلئے
کرتا ہے۔ اور جو نہ کرے تو خدا تو بے نیاز ہے۔ اب اگر
خدا ایک طرف ہمارے عملوں سے بے نیاز ہے۔ دوسری طرف
اگر وہ بے عمل اور بے کاروں کو اپنے فیض سے نیچے لے آئے
تو وہاں تو کوئی کمی نہیں ہے۔ جس نے رحمانیت کے فیوض
عامل اور بے عمل سب کیلئے یکساں کھلے رکھے اُسے اس سے
آگے چلکر کیا تکلیف ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے
جو اپنے خزائن فضل کی کنجی عمل ٹھیراتا ہے۔ تو اس ساری
ربانی مصلحت سے بجز اس کے اور کیا مراد ہو سکتی ہے
کہ وہ ہماری قوت عمل کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہماری
بالقوئی استعدادوں کو بالفعل کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ امر
عمل کے بغیر ناممکن ہے۔ یاد رکھو مذہب اور اسلام کے ورود
کی علّت غائی بھی یہی ہے۔ فلاح یعنی قوائے مضمرہ کا
نشو و نما پانا۔ اسی فلاح کے لئے ایک طرف ہم میں ضرورتیں

لاحق کردیں۔ دوسری طرف دفع ضرورت کے اسباب خود ہی پیدا کر کے ان کے حصول کو عمل سے وابستہ کر دیا۔ نہ ضرورت لاحقہ فی نفسہ کوئی شے ہے نہ اسباب دفع ضرورت بذاتہ کوئی مقصد اولے ہے۔ غرض ان دو چیزوں سے قوتِ عمل کا حرکت میں لانا ہے۔ تاکہ تمہاری ودیعت کردہ قوتیں نشو و نما پا جائیں۔ یعنی ہم مفلحون ہو جائیں ہمارے پاؤں میں چلنے کی طاقت ہے۔ ہم میں ایکطرف بھوک لگا دی۔ دوسری طرف ہم سے کچھ فاصلہ پر پانی اور خوراک کو رکھ دیا۔ جب ہمیں پیاس یا بھوک لگی۔ اُن کے دفعیہ کے لئے ہم اُٹھے اور ہمارے پاؤں کی استعداد رفتار مشق میں آ کر بالفعل ہو گئی۔ یہ ممکن تھا کہ جہاں ہم بیٹھے تھے۔ وہاں ہی آب و دانہ ہر وقت ہمیں ملجائے خواہ فضل ایزدی سے یا کسی فدیہ و سفارش پر یہ سب کچھ ہو سکتا تھا لیکن وہ غرض مفقود ہو جاتی جس کے لئے پیاس و پانی پیدا کیا گیا تھا۔ پیاس اور پانی بذاتہ لاشئے ہیں مقصد پاؤں کی طاقت کو عمل میں لانا تھا۔ اسی طرح ہمارے کُل کے کُل تقاضائے فطریہ یا اُن کا پورا کرنا بذاتہ تکمیل النفس انسانی سے تعلق نہیں رکھتا۔ ان باتوں میں ہم حیوانات سے اشتراک رکھتے ہیں۔ ان میں کمال حاصل کرنا ایک

بہیمیت نہیں تو اور کیا ہے۔ کمالِ نفس سے مُراد اکتساب اخلاق فاضلہ ہے۔ جن کی استعداد حیوانوں میں نہیں لیکن ان اخلاق فاضلہ کا حصُول بعض اعمال کو چاہتا ہے۔ وہ اعمال کبھی ظہُور میں نہ آتے اگر یہ حیوانی تقاضے ہمارے لاحق حال نہ ہوتے۔ مثلاً جُود وسخا صاحبِ مال ہی کیا کرتے ہیں لیکن حصُول مال کی کوشش اولاً کسی تقاضائے بشری کے پُورا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اگر یہ حیوانی تقاضے اپنی آگ مشتعل نہ کرتے تو پھر ان کے بجھانے کیلئے وہ پانی بھی ہم پیدا نہ کرتے۔ جس سے نخل اخلاق کی آبیاری ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دفع تقاضائے اسباب انسانی نصب العین نہیں ہوسکتے۔ اصلی نصب العین تو عمل ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہم جو پیر فقیر مناتے ہیں۔ خدا کے سفارشی تلاش کرتے ہیں۔ فدیہ وکفارے کی ٹوہ میں لگجاتے ہیں۔ ان ہمارے افعال کی محرک وہی اسباب دفع تقاضات حیوانیہ ہیں۔ اس طرح اسباب کے حاصل ہوجانے سے قوت عمل مرجائیگی جس سے وہ مقصد فوت ہوگا جس کیلئے خدائیتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ اور جس مقصد کی خاطر خدائیتعالیٰ کی طرف سے فوقتاً فوقتاً کتب مقدسہ نازل ہوئیں۔ ان حالات میں ہم کس طرح تسلیم کرلیں۔ کہ خدا کی جناب میں فدیہ یا سفارش چل جاتی ہے؛

مسئلۂ شفاعت اِس مسئلۂ سفارش سے کوئی تعلّق نہیں رکھتا۔ یہ مسئلہ اعتقادات و ایمانیات کی بحث میں کسی اور جگہ ہم لکھنا چاہتے ہیں۔ ہم شفاعت نبی کریمؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں اسی دُنیا میں ہماری کما حقہٗ شفاعت کر گئے۔ اور وہ ہمارے لئے بس ہے۔ اس کا مظاہرہ قیامت کے دن ہوگا لیکن شفاعت کی اہلیّت اذنِ ربّی سے وابستہ ہے۔ من ذاالذی یشفع عندہٗ الا باذنہ خدا کے سامنے اُسکے اذن کے سوا کوئی شفیع نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت صلعم کے حق میں اذن مطلوبہ کا شاہد قرآن کریم ہے لیکن آپؐ کی ذات کے سوا تم جن پیروں فقیروں کے یہاں جاتے ہو اُن کے پاس اذن ربی کی کونسی سند ہے +

مسلمانو! خدارا اِن میری باتوں پر غور کرو۔ کسی ایسی بات کو صحیح نہ سمجھو۔ نہ اُسے اسلامی تعلیم کے مطابق سمجھو جس سے قوت عمل کمزور ہوتی ہے یا ذمہ داری کا احساس اُنمیں مرجاتا ہے تمہاری موجودہ تباہی کے اسباب اگر کوئی شخص تلاش کرے۔ تو اُن میں بڑا بھاری حصہ پیر پرستی۔ گورپرستی منتر جنتر۔ ٹونہ تعویذ پائیگا۔ میں ایک سہل بات تمھیں بتلاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جس پیر یا فقیر پر تمہیں اعتبار

ہو - اور جس کے بھروسہ پر تم خود کام کرنا چھوڑ دیتے ہو اس سے تم حلفاً دریافت کرلو - کہ کیا من ذاالذے لیشفع عندہ الا باذنہ کے ماتحت کسی سفارش کا اذن اُسے خدا کی جناب سے مل چکا ہے - اگر وہ اس اذن یابی کا مُدّعی ہے - اور تمہیں اس کے اس دعوے کا ایمان ہے تو بسم اللہ والا اِن نساہ کُن باتوں سے بچو ہاں کسی متقی باعمل برگزیدہ انسان کیخدمت میں اس لئے حاضر ہونا کہ اس سے وصایا تم میں انابت وخشیت پیدا کریں - اس کا اپنا حُسنِ عمل تمہارے لئے نمونہ ہو جائے اسکی صحبت تم میں محبت دین وقوم پیدا کرے یہ تو عین سعادت ہے - یہ بذاتِ خود ایک عمل ہے - کونوا مع الصادقین (صادقوں کی صحبت میں بیٹھو) یہ تو کونوا مع الصادقین کی تعمیل ہے - لیکن اگر کسی بزرگ کے یہاں تم اس خیال سے گئے - کہ تمہارا اُن کو سلام کرنا - تمہارا اُن کو نذر ونیاز - تمہاری مُہمات کے لئے کافی ہے - تو یاد رکھو کہ اس سے نقصان ہی نقصان ہے دُعاء کرنا یا کرانا ایک امر مستحسن ہے - اسکو سفارش زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں - میں نے خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دُعا کی ہے - مصیبت کے وقت برگزیدہ انسانوں سے

دُعائیں کرائی ہیں - وہ دُعائیں قبول ہوئیں - لیکن ان دُعاؤں میں سفارش کا کوئی رنگ نہیں ہوتا - یہ ہمارا ایمان ہے - کہ ہر ایک اِنسان مستجابُ الدعوٰۃ بھی نہیں ہے - اپنے مقربوں کی دُعاء خُدا جلد سُنتا ہے - لیکن وہ اسی طرز پر سُنتا ہے - جس کی تشریح ہم ابھی بالفاظ قرآنی لعلهم یرشدون میں کر چکے ہیں - خُداتعالے کسی مقرب کی دُعاء پر راستے اور اسباب پیدا کرتا ہے - جن پر چلنا یا جن کو استعمال کرنا پھر ہمارا ہی کام ہے +

بعض لوگ آیت ذیل سے سفارش کا جواز ڈھونڈھتے ہیں جس میں خدا سے وسیلہ ڈھونڈھنے کی ہدایت کی گئی ہے قرآن کریم میں یہ دو آیات ہیں جن میں وسیلہ کا ذکر ہے +

(۱) یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون ہ

ترجمہ - اے مومنو! تقویٰ کرو اور اُسے اور اس کے نزدیک ہونے کے ذرائع تلاش کرو - اور اس کی راہ میں جہاد کرو تو فلاح پاجاؤ گے +

(۲) اولٰئک الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلۃ

ترجمہ - جن کو یہ پکارتے ہیں - وہ خود خدا کے قریب ہونے کا ذریعہ تلاش کر رہے ہیں ؟

دوسری آیت تو ان کے مفید مطلب نہیں۔ پہلی آیت انکی تکیہ گاہ ہے۔ جو خدا کے ساتھ تلاش وسیلہ کی ہدایت کرتی ہے۔ حالانکہ یہ آیت اپنے اندر ہی تلاش وسیلہ کا راستہ بتلاتی ہے۔ یعنی وہ کیا ہے۔ اللہ کی راہ میں کوشش کرنا۔ جہاد بالقرآن کرنا۔ یہی ایک راہ ہے۔ جس سے انسان خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔ یہی خدا کے پاس وسیلہ ہے۔ دراصل ساری مصیبت عربی زبان کی ناواقفی نے ڈال رکھی ہے۔ لفظ وسیلہ کے غلط مفہوم نے پیر پرستی کو پیدا کر دیا۔ یہ سب بےعلمی کی شامت ہے۔ اُن کو یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ ایک زبان کے لفظ جب دوسری زبان میں جاتے ہیں۔ تو بعض وقت ان کے معانی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ مثلاً عربی زبان میں دشمن کا منصوبہ توڑنے کیلئے کسی باریک تجویز سوچنے اور عمل میں لانے کا نام مکر ہے۔ جو ایک مستحسن فعل ہے جیسے خود خدا کی شان میں قرآن نے خیر الماکرین بولا۔ اُردو زبان میں اس لفظ نے آکر بُرے معنی اختیار کر لئے۔ اب خیر الماکرین کے معنے کرنے میں اگر لفظ مکر کے معنی اردو زبان والے کیئے جائیں تو خیر الماکرین کوئی صفت حسنہ نہیں ٹھہرتی بلکہ اس سے تو شان خداوندی کا ازالہ ہوتا ہے۔ چنانچہ

بعض آریہ مصنّفین نے اسی بناء پر ہم پر حملہ کیا اور کہا ہے کہ قرآن کا خدا تو ایک بھاری مکّار خدا ہے جو غلطی آریوں سے ہوئی اُسی کے مُرتکب بعض وقت ہم ہو جاتے ہیں۔ ہمارا کیا حق ہے کہ ہم کسی قرآنی لفظ کے وہ معنے لیں جو ہماری زبان نے اس لفظ کو دے رکھے ہیں۔ صحیح طریق تو یہ ہے کہ جس زبان کا کوئی لفظ ہو۔ اگر وہ اس زبان کے لٹریچر میں استعمال ہوا ہے تو اُسے وہ معنی دو جو اُس زبان کا لغت تجویز کرتا ہے۔ لفظِ وسیلہ وسل سے نکلا ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کے نزدیک یا قریب ہونے کی جستجو کرنا ہے۔ وسیلہ وہ چیز یا وہ وجود ہے جس کے ذریعہ ہم کسی دوسری چیز یا وجود کے قریب تر ہو جائیں۔ وسیلہ کے معنی ذریعہ نہیں جو ہم سمجھے ہوئے ہیں۔ بلکہ ذریعۂ تقرب ہے۔ یعنی جس چیز یا جس وجود کے ذریعہ ہم خود مُقربانِ خدا میں سے ہو جائیں وہ وسیلہ ہے۔ ایک صالح کی صُحبت ہمیں صالح بنا دیتی ہے۔ ایک مُقرب اللہ کا قول و فعل۔ اگر ہم اُن پر چلیں۔ تو ہمیں بھی مُقرب خدا بنا دیگا اس طرح اور ان معنوں میں وہ مُقدّس انسان ہمارا وسیلہ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ہمارے اپنے اعمال بھی ہمارا وسیلہ ہوتے ہیں۔ بلکہ حقیقی وسیلہ وہی ہیں۔ بلکہ خاصانِ خدا

کے پاس جانے کا بھی یہی مقصد ہے۔ اُن کی صحبت اُنکے نصائح ہم میں وہ حُسنِ عمل پیدا کر دیتے ہیں جس سے ہم خدا کے قریب ہو جائیں۔ لہٰذا وہ بزرگ وسیلہ نہیں بلکہ اُن کے یہاں جا کر وہ چیز ہمارے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ یعنی صالح زندگی جس کا نام وسیلہ ہے۔ آیتِ زیرِ بحث میں خدا تعالیٰ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم وہ چیز حاصل کریں جس سے ہم اسکے مُقرّب ہو جائیں۔ بالفرض ہمیں کسی چیز کی حاجت ہے وہ خدا کے کسی خاص فضل سے ہی حاصل ہو سکتی ہے جو خاصانِ خدا کا حصّہ ہے۔ قرآن یہ کہاں کہتا ہے۔ کہ تم اس کے حصُول کے لئے کسی مقرب خدا کے پاس جاؤ۔ اور اس کی سفارش تمہیں مورد فضل مطلوبہ کر دیگی۔ قرآن تو کہتا ہے :۔

یا ایہا الذین آمنو اتقو اللہ وابتغوا الیہ الوسیلہ

تم تقوےٰ کرو۔ اور اس طرح اپنے میں وہ چیز پیدا کرو جس سے تم میں تقربِ الٰہی پیدا ہو۔ وہ بات اختیار کرو جس سے تم خود خاصانِ خدا میں سے ہو جاؤ۔ اس آیت میں اسی بات کا نام وسیلہ رکھا ہے۔ تمہارے پیر اور مرشد بھی اگر تمہارا وسیلہ ہو سکتے ہیں تو اُسی وقت جب ان کا تعلق تمہیں قرب الٰہی تک لے آئے۔ تم نے اپنے اندر انکے ذریعہ وہ جوہر پیدا کرنے ہیں جن سے خدا کے فضل کسی انسان

پر اثر کر اس کے مصائب اور احتیاج کو دور کر دیتے ہیں +

ہم نے خدا کی درگاہ کو اس دنیا کے حکام کی کچہری سمجھ رکھا ہے - جہاں سفارش - رشوت - لحاظ چلتا ہے - اور مستحقین انصاف سے محروم رہجاتے ہیں - یہی چیزیں یہاں بعض حکام کے پاس ہمارا وسیلہ ہوجاتی ہیں - کیا ہم نے جس چیز کا نام فدیہ کفارہ یا وسیلہ مذہبی دنیا میں رکھ چھوڑا ہے - وہ یہی تین چیزیں نہیں ؟ اگر تو کسی مصیبت وا حتیاج کے وقت ہمارا کسی بزرگ کیخدمت میں جانا ہی ہم میں تقرب خداوندی کا رنگ پیدا کر دیتا ہے - تو پھر یہ فقیر مناسب صحیح ہے مگر صرف جانے سے تو کچھ نہیں بنتا - ہاں اگر خدا چاہے تو ان کی دعا ہمارے لئے مخرج پیدا کر دے - مگر ان ہی شرائط پر جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے +

عجیب سے عجیب بات یہ ہے کہ جنہیں ہم وسیلہ ٹھیراتے ہیں وہ تو ہمارے معنوں کے لحاظ سے بھی احدیت مآب کی جناب میں وسیلہ نہیں ٹھیر سکتے - کسی کا کسی بزرگ کی اولاد ہونا تو اُسے مقرب الٰہی نہیں بنا سکتا - لیکن تم نے تو ہر بدعمل کو خواہ اسمیں ہر عیب شرعی ہو اس کے آل ہی ہونے پر قبلہ حاجات بنا لیا ہے - یہ سب غذلان کی راہیں ہیں - خود بتول پاک کو حکم ہوتا ہے کہ تیرے لئے اولاد نبی ہونا کافی نہیں تیرے

عمل ہی جب مایۂ ناز و سرمایۂ امتیاز ہو سکتا ہے۔ تو پھر تیرہ سو برس سے بعد خاتونِ جنت کے نے عمل ہی نہیں بلکہ بد عمل نام لیوا خدا کی جناب میں جس شمار و قطار میں آ سکتے ہیں وہ ظاہر ہے سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ تمہارا حل مشکلات۔ تمہارا گنڈہ و تعویذ۔ تمہاری سفارش حتیٰ کہ تمہارا کفارہ اگر کوئی چیز ہے تو **عمل** ہے۔ اِنَّ الحسنات یذھبن السیئات نیکیاں ہی بدی کو بھسم کیا کرتی ہیں +

حقیقتِ وسیلہ سمجھنے کے لئے ایک اور بات کی طرف میں تمہیں متوجہ کرتا ہوں جس کی تعلیم قرآن کرتا ہے۔ وسیلہ وہ چیز ہے جو ایک کو دوسرے سے پیوند کر دے۔ کیا ناپاک اور پاک چیزوں میں کوئی چیز توسّل کا کام دے سکتی ہے؟ کیا کسی تیسری چیز کے ذریعہ دو متضاد چیزیں اپنی اصلی حالت کو قائم رکھتے ہوئے ایکدوسرے سے مل سکتی ہیں۔ قرآن کو دیکھو تمہیں یہی نظر آئیگا کہ جس صفتِ خداوندی سے تم ضرورت کے وقت تمسّک کرتے ہو۔ اس کے مناسب حال اگر تم میں خود کوئی جوہر ہو تو تم اس صفت خداوندی کے سایہ تلے آ جاتے ہو۔ مثلاً کسی مصیبت مختصہ کے وقت تمہارے لبوں پر اضطراراً وہ اسم خداوندی آ جاتا ہے جس سے اس مصیبت کو تعلق ہے۔ مثلاً کسی غلط کاری کے افشاءِ راز سے بچنے کے لئے تم

ستّارُ العیُوب کو پکارا کرتے ہو لیکن یاد رکھو کہ از رُوئے تعلیم قرآن اُن اسماءِ حُسنیٰ سے تمہارا حقیقی تمسّک اُسی وقت ہو سکتا ہے جب خُود تم میں اُن اسماء کے مناسب حال رنگ پیدا ہو جائے فیضِ رحیمیت اُس اِنسان کی طرف نہیں جاتا جو دوسروں پر رحم کرنا نہیں جانتا۔ دوسروں کی پردہ دری کرنے والا کبھی ستّارُ العیُوب کے فضل کا مورد نہیں ہو سکتا جو دوسروں کی غلطیاں مُعاف نہیں کر سکتا۔ اس پر غفُور الرّحیم کی نگاہ نہیں پڑتی۔ ناپاک اِنسان اور خدائے قدّوس میں کوئی جوڑ نہیں۔ فی الجملہ جس قسم اور جس رنگ میں خُدا کا فضل تم اپنی طرف جذب کرنا چاہو اس کے مناسب حال نیکی کسی محتاج مخلوق سے تم کرو رحم کرو تا کہ رحم تم پر نازل ہو۔ کیا کوئی اِنسان خواہ خود وہ کیسا ہی برگزیدہ ہو ایک ناپاک اِنسان اور خدائے قدوس میں یا ایک ظالم اور رحیم خدا میں کوئی توسّل پیدا کرا سکتا ہے؟ حقیقی وسیلہ وہ چیز یا وہ عمل یا کسی اِنسان کی وہ تعلیم و تربیت ہے جس سے ایک ناپاک سے ناپاکی۔ ایک ظالم سے ظلم دُور ہو کر اسمیں اور خدائے رحیم و قُدّوس میں جوڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی جوڑ کا نام نجاتِ اُخروی اور فلاح دارین ہے۔ اسی سے ایک انسان متصف باخلاقِ ربّانی ہو جاتا ہے۔ اور اپنے اندر تخلقوا باخلاق اللہ کا رنگ دیکھ لیتا ہے۔ اس توسّل ربّانی کا اگر کوئی وسیلہ دُنیا میں

ہے تو محمدؐ کی ذات پاک (علیہ الف الف صلوٰۃ وسلام)
اور اس کا قرآن ہے یہی وہ **شفاعت** ہے جو ہم نہ بین کی اس
دُنیا میں آپ کر گئے۔ جس کے مظاہرہ تام کے لئے میدان رستخیز
مُقدّر ہے۔ **شفاعت** اور **وسیلہ** ہر دو لفظ اپنے معنوں میں
ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تم نے تعمیر عمل کے
ساتھ اپنے مکان کے لئے ربّانی مکان کا شفعہ حاصل کرنا ہے
جس مقامِ ربّانی پر نجات اُخروی کا قیام ہے اُس کا تمہیں شفیع
بننا ہے۔ **محمدؐ** ہی وہ **شفیع** ہے جس کے پیچھے لگ کر
اور جس کا دامن ہاتھ میں پکڑ کر تم اپنے مقام کے لئے ربّانی
مقام کا شفعہ حاصل کر سکتے ہو۔ قُل اِن کنتم تحبّون اللہ
فاتبعونی یحببکم اللہ (اگر تم چاہتے ہو کہ خدا تم سے پیار
کرے۔ تو تم میری پیروی کرو) یہ خوش اعتقادی
نہیں یہ حقیقت ہے۔ کیونکہ اتباع محمدؐ اتباعِ قرآن ہے
اور قرآن نے ہر ایک قسم کی بدی سے بچنے اور ہر نجاست سے
پاک ہونے کا راستہ بتلایا ہے۔ یہ بات ہمیں کسی اور کتاب
میں نظر نہیں آتی۔ رہا کفّارہ سو خود مغربی دُنیا کا دو ہزار
برس کا تجربہ صاف ثابت کرتا ہے۔ کہ ایمانِ کفّارہ نے بدی
کو کم نہیں کیا۔ بلکہ احساس ذمّہ واری کو کمزور کر کے گناہ کو شیرِ مادر
کر دیا۔ علاوہ ازیں جو حقیقت نجات ہم نے اُوپر بیان کی ہے

وہ کفارہ سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ نجات کے معنی اسلام میں سزا سے بچنا نہیں۔ بلکہ مطلوبہ نیچی کو اپنے اندر پیدا کرلینا ہے۔ قرآنی معنوں میں ایک ظالم کی نجات صرف اس عذاب سے رہائی نہیں جو ظلم کی پاداش میں ملتا ہے۔ بلکہ اُس کی فطرت میں سے استعداد ظلم کو دُور کر دینا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں عذاب دوزخ اُن تلخ کام اور تکلیف دہ ذرائع کا نام ہے جس سے یہ تطہیر مطلوبہ حاصل ہوتی ہے۔ جنت حقیقت حال یہ ہے۔ اور یہ وہ بلند فلسفہ ہے جسے انشاء اللہ کسی کتاب میں بعنوان جنت و دوزخ ہم لکھیں گے۔ تو پھر ہم مسلمان اگر کلیسیہ کی اس طوطا کہانی کے سمجھنے سے قاصر رہیں جسمیں عیسوی کفارہ کی حقیقت بیان کیجاتی ہے تو ہم مجبور ہیں۔ جسے تم نجات سمجھے ہوئے ہو یعنے کسی مار کٹائی سے بچنا وہ تو ہماری نگاہ میں کچھ چیز ہی نہیں۔ تو پھر مسیح پڑے سزا بھگتیں ہمیں کیا؟ ہاں اگر کسی طبیب کی خودکشی میری خلقت سے استعداد مرض الموت نکال دے۔ اُس کا آنکھ پھوڑ لینا میری ضعف بصارت کا علاج ہو جائے۔ تو پھر کفارہ مسیح بھی صحیح ہے۔ نجات اگر کسی خارجی عذاب سے بچنے کا نام ہے تو کسی غیر کا وجود مجھ میں اور عذاب میں حائل ہوکر میرا کفارہ میری سپر۔ میرا ذریعہ نجات ہوسکتا ہے

لیکن اگر نارِ دوزخ وہ آگ ہے جو ایک ناپاک دل کے اندر جوش زن ہوتی ہے۔ اگر عذاب وہ پست فطرتی ہے جو میری رفتار کو کمالِ حقیقی کی طرف جانے سے روکتی ہے۔ تو پھر یہ تکلیفیں تو میرے اندر ہیں۔ میری اندرونہ تبدیلی ہی اُن کا علاج ہو سکتی ہے۔ اگر اس دُنیا میں ایک بد افعال شخص صرف کفّارہ پر ایمان لاکر استعداد نیکی نہیں پیدا کر سکتا جس پر تجربہ نے مہر لگادی ہے۔ تو پھر یہ سب باتیں فدیہ کفارہ۔ سفارش بیہودہ ہیں +

آہ ہم ایک عیسائی۔ ایک ہندو یا کسی اور مُشرک قوم کے مقابل اُن دلائل کو تو پیش کرتے ہیں۔ اور خوش بھی ہوتے ہیں۔ کہ اسلامی تعلیمات ان بیہودگیوں سے کس قدر پاک ہیں مگر ہماری حالت میدانِ عمل میں وہی ہے۔ وہ بات جو اوروں کیلئے ناجائز ہے وہ ہمارے لئے کیسے جائز ہو سکتی ہے۔ خدا حالی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے جس نے یہ صحیح نقشہ ہم مسلمانوں کا ابیات ذیل میں کھینچا ہے

کرے غیر گر بُت کی پُوجا تو کافر	جو ٹھیرائیں آتش کو قبلہ تو کافر
کواکب میں مانیں کرشمہ تو کافر	جو ٹھیرائیں بیٹا نبی کو تو کافر

مگر مومنوں پہ کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رُتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ جا جا کے نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں مُرادیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

تقدیر

والقدر خیرہٖ و شرہٖ من اللہ تعالٰی

تقدیر اور اس کے تقاضے صحیح اور اٹل ہیں جو کچھ دُنیا میں ہو رہا ہے وہ تقدیر ہی کے ماتحت ہوتا ہے جو انسان کے لاحق حال ہوتا ہے وہ تقدیر سے باہر نہیں ہے ہماری اچھائی بُرائی سب مُقدّر ہے ہم احاطۂ تقدیر سے باہر نہیں جا سکتے انسان کی حرکات سکنات غرض جو کچھ کہ اُسے پیش آتا ہے اچھا ہو یا بُرا وہ سب تقدیر ہی تقدیر ہے۔

یہ لُبّ لباب ان خیالات و اقوال کا ہے جو مسلمان غیر مسلمانوں کی زبان پر اور دل میں ہر مصیبت اور غلط کاری کے نتائج پیدا ہونے پر آجاتا ہے۔ جب نفس لوّامہ کسی بدعملی یا بد نتیجہ پر آواز اُٹھاتا ہے تو اسی عقیدہ سے اس کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ بد افعالی کے بد نتائج جب دل میں رنج و پشیمانی پیدا کرتے ہیں تو ان ہی باتوں کو سامنے رکھ کر

ہم اپنے نفس کو گنہگار نہ ٹھیرا کر ندامت و پشیمانی کو محسوس نہیں کرتے جس سے اصلاح اگر ممکن بھی تھی تو ہمیں میسّر نہیں آتی۔ غفلت سُستی۔ بیکاری۔ الغرض ہر ایک بدی جس کے ذمّہ وار ہم ہی ہو سکتے تھے اُن سب کی جوازیت ہم اسی مسئلہ میں تلاش کر لیتے ہیں۔ اور اِس طرح ہمیشہ کی تباہی اپنے حصّہ میں لے آتے ہیں +

یہ سب کچھ ہے۔ لیکن جو الفاظ تقدیر کے متعلق اُوپر لکھے گئے ہیں۔ ان میں کا ایک فقرہ ایک لفظ بھی غلط نہیں۔ وہ صداقت کی جان اور سچّائی کی رُوح رواں ہیں۔ اور حق پوچھو تو تقدیر وہ صداقت ہے۔ جس کی تعلیم کے بغیر کوئی مذہب حق کا مکمل نہیں ہو سکتا۔ مذہب دراصل تقدیر کی ہی حقیقت سے آشنا کرنے آیا۔ اگر وحیِ الٰہی کا مقصد فلاحِ انسانی تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ تو یہ فلاح تقدیرِ ربانی پر ایمان رکھنے۔ اور اس کے ماتحت اپنے اعمال کو لانے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ تقدیر پر ایمان لانا ایک مسلمان کا فرض ہے۔ یہ ہماری ایمانیات میں داخل ہے۔ حق پوچھو تو صفت ایمان کے باقی چھ اجزا۔ اللہ ملائکہ۔ کُتب۔ رُسل۔ یوم آخر۔ حشر بعد الموت۔ یہ سب کے سب ایک مسئلہ تقدیر کی ہی خاطر ہیں۔ بلکہ جس کا نام ہم نے

سائنس رکھا ہُوا ہے۔ وہ تقدیر کا ہی علم ہے۔ الغرض مومن کافر۔ خُدا کا مُنکر یا اُسکی ہستی کا قائل سب تقدیر پر عملاً ایمان رکھتے ہیں۔ اسکی اصل حقیقت کا آشنا کبھی نقصان نہیں اُٹھا سکتا۔ اس پر سچّا ایمان ہی معراج ترقی کا زینہ ہے +

مسئلۂ تقدیر پر میں نے یہاں دو مُتضاد خیالات بیان کئے ہیں۔ یہ کوئی مجنُونانہ حرکت نہیں۔ یہ حقیقتِ حال ہے۔ یہ مسئلۂ تقدیر کے دو مُتضاد پہلو نہیں۔ بلکہ مسئلۂ تقدیر کو غلط یا صحیح سمجھنے سے یہ دو مُتضاد مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔ آخرُ الذکر صداقتیں تو اُس حقیقت کے سمجھنے اور اس پر عملاً ایمان لانے سے وابستہ ہیں۔ جو قرآن نے مسئلہ تقدیر کے متعلّق بیان کی ہے۔ اور اوّل الذکرہ باتیں ہیں جو مسئلۂ تقدیر کو غلط طور پر سمجھنے سے دُنیا میں پیدا ہو گئیں +

اِنسان ایک حد تک ذمّہ واری سے طبعاً دِل چُراتا ہے۔ ایسا ہی صدُورِ غلطی پر اپنے آپ کو ملزم ٹھیرانا بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ کوشش کے ساتھ دوسرے کے دروازہ پر الزام لے آتا ہے۔ فطرت اِنسانی کے یہ دو غلط میلان اسی مسئلۂ تقدیر کے غلط مفہوم سے تسلّی پاتے ہیں۔ ایک بدمعاش ایک

اپاہج و غافل اپنی بدعملی اور بے عملی کے بُرے نتائج کا باعث اپنے آپ کو تو ٹھیراتا نہیں چاہتا۔ وہ بغیر قصور تو اپنی نگاہ میں مُلزم بننا نہیں چاہتا۔ اسلئے اس بدعملی کا ذمہ وار وہ اپنی قسمت کو ٹھیراتا ہے۔ کس قدر رنجیدہ مقام ہے۔ کہ انسان کی فطرت میں خدا نے یہ بات کہ وہ اپنی نگاہ میں بھی اپنے آپ کو مُلزم ٹھیرانا نہیں چاہتا اسلئے رکھی تھی کہ وہ طبعاً بدی سے بچ جائے۔ مسئلۂ تقدیر کے غلط مفہوم سے یہ فطرت سعید مرجاتی ہے۔ جب کسی اور انسان کو وہ بُرے نتائج کا مُلزم نہیں ٹھیرا سکتا۔ تو ملامت نفس کے مقابل اسکی آخری سپر اسکی قسمت اور تقدیر ہوتی ہے۔ وہ سب خرابیوں اور بداعمالیوں کو اپنی قسمت کے حوالہ کرکے دل ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ اور اس طرح اصلاح کا دروازہ اپنے پر بند کر لیتا ہے۔ کسی غلطی کی اصلاح تو جب ہو سکتی ہے۔ کہ کوئی اپنا قصور قبول کرے۔ قصور جب قسمت کا ٹھیرا تو پھر کوئی کس غلطی کی اصلاح کرے۔ وہ تو قسام ازل ہی کی تقسیم ہے۔ وہ تو ہمارے فعل یا بدعملی سے ہی پہلے نہیں۔ بلکہ ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے ہمارے حصہ میں لکھی جا چکی ہے ؏

جو کہ پیشانی میں لکھی ہے وہ پیش آئی ہے

وہ تقدیر ہے وہ ٹل کیسے سکتی ہے۔ ہم علم و ارادہ رکھ کر بھی قسمت کے

ہاتھ میں ایک بیجان مشین ہیں - الغرض اس قسم کے خیالات ہمارے دِل میں اُٹھتے ہیں - جب ہم اپنی غلطیوں سے مصیبت کا مُنہ دیکھتے ہیں - ہمارا ایک نادان بچہ جب تیز طبیعتی اپنی ناتجربہ کاری - اور اپنے بعض جذبات پر قابو نہ پانے کے باعث فی الجملہ اپنی غلط کاری کے باعث اپنی عمر کے گرانمایہ دو سال اور والدین کا کئی ہزار روپیہ تباہ کر چکا تو میرے ملامت کرنے پر گو ادب کے لہجہ میں لیکن اپنی غلطی کا جواز اس مصرعہ میں ڈھونڈتا ہے - ع

وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

گویا خدا کو ہی یہ منظور تھا کہ اس نوعمر کو یہ نقصان پہنچے ؛ پیش ازیں کہ میں یہاں لکھوں کہ میں نے اس کے جواب میں کیا لکھا - یا مسئلہ تقدیر پر قرآن کی روشنی میں کچھ لکھوں میں اُن مسلمانوں سے جو تقدیر کو یہ معنے سونپ کر تباہی کی طرف اپنے آپ کو لیجا رہے ہیں ایک بات پوچھتا ہوں - کیا تم خدا کو رحیم - رؤف اور رحمٰن نہیں سمجھتے ؟ بروئے حدیث شریف گیا خدا اپنی مخلوق کے ساتھ اُس محبت سے بھی زیادہ محبت نہیں کرتا جو ایک ماں کو بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے ؟ تو پھر کس طرح ایسا شفیق اور مہربان خالق اس قسمت کا تجویز کرنے والا ٹھہر سکتا ہے جس کے رُو سے

تمہارے حصہ میں مصائب و شدائد آجاتے ہیں۔ اگر خُدا تعلیم قرآنی کی رُو سے قُدوس ہے۔ اور بدی اسکی شان کے منافی ہے۔ تو پھر وہ کس طرح اس تقدیر کا خالق ہو سکتا ہے۔ جس نے تمہیں بدچلن۔ بدکار۔ بدقماش بنا رکھا ہے۔ ایک شرابی۔ زانی۔ قمار باز شخص میں جب کبھی جذبۂ ندامت پیدا ہوتا ہے۔ تو یہی کہہ کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ کہ میری قسمت میں ہی شرابی اور زانی ہونا تھا۔ ایک نوعمر اپنی بدعملیوں سے متروکۂ پدری تباہ کر کے مفلوک الحال اور محتاج ہو جاتا ہے۔ وہ بھی جب روتا ہے تو قسمت کو۔ نہ صرف فقر و فاقہ ہی اسکی قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے۔ کہ نہ صرف یہ فقر و فاقہ ہی اس کا مقدّر ہے۔ بلکہ وہ بدکرداریاں بھی اُس کے حصہ میں پہلے ہی سے آچکی تھیں جن سے وہ اِن حالوں پہنچا۔ یہ باتیں صحیح ہوں یا غلط لیکن مسلمانو! تم غور تو کرو۔ یہ تمہارا اقتسام ازل اِس قسم کی لوگوں کی تقدیر تجویز کر کے کن صفات کا خُدا بن جاتا ہے؟ اور آیا یہ صفات اس خدا کے مناسب حال ہیں جس کی صفات ہم قرآن میں پاتے ہیں۔ غور کرو کہ جب تم یہ کہتے ہو کہ زید کی قسمت میں یہی بدمعاش بننا تھا۔ یعنی وہ خُود بدمعاش نہیں بنا۔ بلکہ اس کی پیدائش

سے بہت پہلے نہیں نہیں - روزِ ازل کے وقت کسی نے اس کا بدمعاش ہونا مُقدّر کردیا - جس نے ایسا کیا - اب وہ کون ہے ؟ تمہارا خدا - العیاذ باللہ کیا رحیم - رحمٰن - رزّاق - خدا کی یہی شان ہے کہ اسکی تقسیم تلے دُنیا میں مُفلس قلّاش - فی الجملہ نانِ شبینہ کے محتاج انسان پیدا ہوں - تم تو از رُوئے تعلیم قرآن خدا ئیتعالیٰ کو کل نیکیوں اور طہارتوں کا سر چشمہ - کُل پاکیزگیوں کا منبع - ہر قسم کی بدکاری - بدعملی سے مُتنفّر سمجھتے ہو - کیا یہ وہی قدوس خدا ہے جس نے ہر قسم کے زناکار - خائن - غدار - الغرض طرح طرح کے بدکاروں کا ایسا پیدا ہونا پہلے سے تجویز کر رکھا ہے ؟ یا تو بدکاریوں کے ذمّہ دار خود بدکار ہے ورنہ اگر یہ بدکاری انسان کے اختیار سے باہر تھی تو پھر اس کا ذمّہ دار وہ ہے جس کے اختیار میں یہ ہے - تمہارے مفہوم تقدیر سے اِن سب بدیوں کا فاعلِ حقیقی معاذاللہ خدا ٹھیرا +

مسلمان ایک اَور امر پر بھی غور کریں - اگر غلطیوں کا ارتکاب ہمارے ارادہ و اختیار سے باہر ہے تو پھر ان غلطیوں کی سزا الصاقاً ہم پر عائد نہیں ہونی چاہئے - یہ تو ایک ادنےٰ تہذیب والی گورنمنٹ کے تعزیری ضوابط میں بھی ہم

پاتے ہیں۔ کہ کسی جرم کا اصلی مجرم بعض وقت وہ شخص نہیں ٹھہرایا جاتا جس سے فعل جرم ہوتا ہے۔ بلکہ اصلی مجرم وہ ہوتے ہیں جن کی منشاء تجویز یا تحریک و اشارہ سے کوئی جرم پیدا ہوتا ہے۔ فعل جرم کا کرنیوالا اسی حد تک سزا کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے جہانتک صدور جرم میں اسکی اپنی عقل سمجھ یا ارادہ کا حصہ ہوتا ہے۔ ایک معصوم بچہ کے ہاتھ سے اگر کوئی شخص دوسرے کو زہر کھلا دے تو بچہ سزا نہیں پا سکتا پھانسی پر وہی چڑھیگا جس نے بچہ کے ہاتھ میں زہر دیا۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ مرتکب جرم سزا نہیں پا سکتا جو یہ ثابت کردے کہ ارتکاب جرم میں اسکی رضامندی اور اختیار کا کوئی دخل نہ تھا۔ کیا عدالت خداوندی دنیوی عدالتوں سے بھی گئی گذری ہے۔ جب از روے مسئلہ تقدیر ہماری غلط کاریاں ہمارے اختیار اور رضامندی سے نہیں ہوئیں تو پھر اس کا میزان عدل معنی کیا رکھتا ہے؟ اس نے بدکاروں کے لئے دوزخ کیوں بنا رکھی ہے۔ مثال کے طور پر بعض وقت ضروریات جنگ بعض مقامات پر فوجی لوگوں کے سوا کسی اور کا جانا آنا تعزیراً بند کر دیتی ہیں۔ اس کے متعلق گورنمنٹ قانون بنا کر اعلان کر دیتی ہے۔ لیکن اگر کوئی غیر فوجی شخص ان ممنوع مقاموں پر

پایا جائے۔ اور بروقت مواخذہ یہ ثابت کرے۔ کہ وہ خود
وہاں نہیں آیا۔ بلکہ زید بکر خالد نے کسی اور مقام پر اُسے سوتے
پایا۔ اسکی مشکیں باندھ لیں۔ اور اُسے اٹھا کر وہ یہاں
لائے۔ اور اسکی مشکیں کھولکر چھوڑ گئے۔ تو کیا سزا کا
مستحق وہ شخص ہوسکتا ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ سزا کے
مورد زید اور اس کے معین جرم ہونگے۔ لیکن اگر یہ تینوں
قانون کے مجوّز بھی آپ ہی تھے تو پھر اُن کا جرم بہت ہی
سنگین ہو جاتا ہے۔ تمہارا خدا تو معاذ اللہ اس سے بھی
کہیں زیادہ مورد الزام ہو جاتا ہے۔ جس نے تمہارے
پیدا ہونے سے پیشتر ہی تمہاری ناگفتہ بہ قسمت کا فیصلہ
کرکے تمہیں تمہاری رضامندی اور اختیار کے بغیر
ایسے ماحول میں پیدا کیا۔ تمہارے آگے ایسا راستہ مقدر کر دیا
کہ جس میں رہ کر اور جس پر چلکر تمہاری یہ حالت ہوئی پھر
تمہیں دوزخ میں کیوں ڈالتا ہے۔ یہاں کا جہنّم تم الگ
بھگتتے ہو۔ وہاں کے لئے دوسرا عذاب موجود ہے۔ یہ
کونسی عدالت و نصفت شعاری ہے۔ حق تو یہ ہے۔ کچھ
تمہارا ہی اس پر احسان ہے غلطی اسکی اور تم قبول کر لیتے
ہو ؎

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ ۔۔۔ تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من است

حافظِ شیراز کو یہ ادب آموزی مبارک۔ ہم اُس مے کے متوالے نہیں جسے پی کر ہم ایک طرف تو مودب بنیں دوسری طرف اپنی جائے ادب کو ہی سرچشمہ گناہ ٹھیرا کر سُوئے ادبی کے مرتکب ٹھیریں ٭

٭ خدا نے ہمارے لئے تو گنہگار زندگی پسند نہیں کی۔ اگر اسکی خواہش پر ہی ہمارے اس دُنیا کے حالات چھوڑے جاتے ہیں تو وہ تو ہمارے لئے نیکی اور خیر ہی پسند کرتا ہے۔ واذا فعلوا فاحشۃ قالوا وجدنا علیھا اباءنا واللہ امرنا بھا قل ان اللہ لا یامر بالفحشاء اتقولون علی اللہ مالا تعلمون۔ قل امر ربی بالقسط

یہ لوگ گناہ کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اپنے آباؤں کو ہم نے ایسا ہی کرتے دیکھا اور خدا کا بھی یہی حکم ہے۔ ان کو کہدو کہ خدا تو حکم بدی کا نہیں دیتا جس بات کا علم نہ ہو وہ خدا کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو۔ خدا تو نصفت شعاری کو ہی پسند کرتا ہے۔ اسکے علاوہ ایک اور جگہ قرآن اُن لوگوں کے جواب میں جو اپنی بدیوں کو مشیت ایزدی کی طرف منسوب کر کے ملامت سے بچنا چاہتے ہیں کہتا ہے۔ کہ اگر مشیت ایزدی پر ہی بات آرہی ہے تو خدا تو خیر ہی چاہتا ہے +

ان الفاظ پر غور کرو منشاء خداوندی صاف الفاظ قرآن میں ظاہر ہو رہی ہے۔ خدا کو تو یہ ہی منظور ہے کہ ہم نیک بنیں۔ ہماری قوتیں صحیح طور پر استعمال ہوں۔ ہاں اچھی استعداد ہی عطا فرمانے کے بعد اس کے مقرر قوانین نتیجۃً

حافظ کی اِس تھیالوجی کے مُقابل ہمیں کلیسیہ کی تھیالوجی کچھ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے ۔ خدا جانتا تھا کہ ہمارا گناہ کرنا ہماری فطرت کا تقاضہ ہے جو ہم پیدائشی ساتھ لائے ہیں ۔ یعنی حسبِ تعلیم کلیسیہ اِنسان فطرتاً گنہگار پیدا ہُوا ہے ۔ بدی اُس نے آدمؑ سے ورثہ میں پائی ہے جس کے ارتکاب سے وہ فطرتاً نہیں رُک سکتا ۔ اگر یہ درست بھی ہو تو بھی کلیسیہ کا فلسفہ غلط ہے ۔ کہ انسان کے گناہ پر عدل خداوندی سزا تجویز کرتا تھا ۔ مگر رحم خداوندی انسان کو بچانا چاہتا تھا ۔ محبّتِ خداوندی نے دونوں تقاضوں کو پُورا کر دیا ۔ یعنے خدا نے بہ لباسِ اِنسان خود سزا بھگت لی ۔ عدل بھی ہو گیا اور رحم بھی ۔ لیکن یہ کہاں کا عدل ہے ۔ کہ آدمؑ کی بجائے آدمؑ کی اولاد پکڑی جائے ۔

تمہاری زندگی میں وہ کچھ پیدا کر دیتے ہیں جس کی طرف تمہارے عمل جاتے ہیں ۔ اِس طرح خدا وہ کر دیتا ہے جو تمہارے عمل کا نتیجہ ہونا چاہئے ۔ لہٰذا کسی نادان کا اپنی اختیار کردہ غلط راہ کے جواز میں یہ کہ دینا کہ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے غلط ہے ۔ خدا کو تمہارے اعمال پر ثمرات مرتب کرنے ہیں اسلئے اسے وہی منظور ہوتا ہے جسے پہلے تمہارے عمل منظور کرتے ہیں ۔ خیر و شر کے قوانین جو خدا تعالےٰ نے بنا رکھے ہیں کسی وقت بھی اپنے عمل کے بغیر نہیں رہتے ۔ اُن قوانین کے ماتحت اگر اسباب شر سے شر پیدا ہو تو ایک معنی میں یہ کہ سکتے ہیں کہ خالق شر خدا ہے کیونکہ اسکے بنائے ہوئے قانون کے ماتحت یہ نتیجہ شر مترتب ہوا ہے ۔ اس حقیقت کی ناآشنائی نے دنیا میں جہالت پیدا کر دی ہے ورنہ الا خدا تو نہ خالق شر نہیں ہے

پھر مواخذہ تو ہم سے ہو۔ گو وہ بھی غلط لیکن سزا بھگتنے مریم کا بیٹا آئے۔ یہ تو عدل نہیں یہ تو ظلم ہی ظلم ہے۔ ہاں اگر یہ مان لیا جائے کہ ابنِ مریم واقعی خدا بہ لباس انسان تھا اور وہ دُنیا میں گناہ اِنسانی کی پاداش میں سزا ہی بھگتنے آیا تھا۔ اور اسکی بعثت کی کوئی اور غرض و غایت نہ تھی تو پھر ایک پہلو پر خدا کا عدل قائم رہجاتا ہے۔ خدائیتعالی نے دیکھا کہ اِنسان میں جو ارتکابِ گناہ کا خاصہ ہے۔ وہ اسکی فطرت اور پیدائش میں ہے۔ جس پر انسان کا کوئی اختیار نہیں۔ علاوہ ازیں نہ یہ بد فطرت اسکی رضامندی پر اُسے ملی۔ لہٰذا ارتکاب گناہ پر انسان عدلاً مستوجب سزا نہیں ہوسکتا۔ جس فطرت کے ماتحت اس نے گناہ کیا ہے۔ وہ تو میری (خُدا کی) بنائی ہُوئی ہے۔ اِنصافاً گناہ میرا ہے۔ سزا مجھ پر عائد ہونی چاہیئے۔ عدل کا تقاضہ یہی ہے۔ کہ میں خود ہی اِنسان کا لباس اختیار کر کے سزا بھگتوں۔ سو ایسا ہو گیا۔ اِس طرح عیسائی تھیالوجی میں تو اس تقدیر کا جواب ہے لیکن بعض مسلمان اگر تقدیر کے ماتحت وہ امور مانتے ہیں جن کا ابھی ذکر ہو چکا ہے تو پھر انہوں نے خدا کے عدل کا کیا ثبوت تلاش کیا ہے جبکہ کتاب جیسے کہ ہم قرآن مجید کو پاتے ہیں۔ لکھا

لہا کسبت و علیہا ما اکتسبت کا اعلان کرے۔ اور اس قسم کی اور بیسیوں آیتوں میں انسان کو ہی اُس کے نیک و بد اعمال کا ذمّہ وار ٹھیرائے۔ اِس دُنیا کو مزرعۂ آخرت قرار دے۔ جزا و سزا کے قوانین مرتّب کرے۔ اور یوم قیامت کے متعلق کُھلے الفاظ میں یہ کہے۔ فالیوم لا تظلم نفسٌ شیئًا و لا تجزون الا ما کنتم تعملون (اُس دن کسی نفس پر کوئی ظلم نہوگا۔ اور تمہیں تمہارے عمل کے سوا اور کسی چیز کا عوض نہ ملیگا) بہشت و دوزخ ہمارے نیک یا بدعمل کے مقابل میں رکھے۔ میزانِ عمل تجویز کرے معراجِ ترقی کا راز ایک طرف۔ اور بدی کی تخویف اور نیکیوں کی تحریص دوسری طرف اِس مختصر جملہ میں رکھدے۔ فمن یعمل مثقال ذرۃٍ خیرًا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃٍ شرًا یرہ (جو ذرّہ بھر نیکی کرے گا وہ بھی پا لیگا۔ جو ذرّہ بھر بدی کریگا وہ بھی پا لیگا) ایسی کتاب کس طرح مسئلۂ تقدیر کی تعلیم کر سکتی ہے۔ اگر اس کے مشہور معنے صحیح ہیں۔ جب ہماری منشاء کے بغیر ہی نیک یا بد عمل ہمارے متعلق کسی نے مقدّر کر رکھا ہے جیسے ہم ایک بیجان مشین کی طرح ظہور میں لے آتے ہیں۔ تو پھر کس کی ذمّہ واری؟ کہاں کی جزا و سزا؟ میزانِ عمل

ایک امر مہمل اور بہشت و دوزخ طبع استبداد کی تلون +

یہ بات ایک منٹ کے لئے بھی نہ بھولو۔ کہ ذمّہ واری عمل علم و اختیار کو چاہتی ہے مجبور یا نا واقف لوگوں کو لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت کا اعلان نہیں سُنایا جاتا۔ قانون توڑنے کی سزا اُسی کو دیجا سکتی ہے۔ جسے اول قانون سے اِطلاع دیجائے۔ اور پھر وہ اپنی رضامندی و ارادہ سے قانون توڑے۔ جو بلا رضامندی خود دوسروں کے ہاتھ میں آلۂ مجبوری ہو کر قانون کی خلاف ورزی کرے وہ سزا نہیں پا سکتا۔ بدعملی کی سزا اسی انسان پر مُرتّب ہوتی ہے جسے پیش از وقت لا تقربا ھذہ الشجرۃ سُنا دیا جاتا ہے۔ جسے بتلا دیا جاتا ہے۔ کہ تیری ہر ایک قوّت شجر کی طرح اُگتی ہے اور نمو پاتی ہے۔ وہ بدی یا نیکی کا شجر بن سکتی ہے۔ تمہاری ہر ایک قوّت کا اس قسم کا استعمال یا اُس کا ایسا اُٹھان یا پھیلاؤ اُسے شجرِ خبیثہ کر دے گا اگر اس سے بچے رہو گے۔ تو پھر اس کا دوسرا استعمال تمہارے لئے ایک باغ عدن پیدا کر دیگا۔ یا ادم اسکن انت وزوجك الجنۃ وکلا منھا رغداً حیث شئتما ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظٰلمین اے آدم تو اور تیرا رفیق اس باغ میں رہو جس طرح چاہو پھلو پھولو

ہاں اس درخت کیطرف نہ جائیو ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔ اے انسان تیری ایک ایک قوت ایک ایک عظیم الشان باغیچہ تیرے اندر ہے۔ اگر وہ کامل نشوونما پا جاوے تو اس دنیا میں بھی اور پوری طاقت کے ساتھ تھا حکر آنیوالی دنیا میں وہ تیرے لئے جنت راحت اور فردوس عشرت بنجائیگی۔ ہاں یہ بھی یاد رکھنا اسی ایک قوت کا ایک نلے براہ اُٹھان اُسے شجر خبیثہ کر دیگا۔ اور تجھے اُس جنت سے محروم کر دیگا۔ اس کے نزدیک تجھے نہیں جانا ہوگا +

جب تک ایک مُقنّن اپنے قانون کا اعلان نہ کرے جرائم کے کوائف سے لوگونکو اطلاع نہ دیدے کسی ایسی چیز کو جُرم نہ ٹھیرائے جس سے بچنے کی اسمیں طاقت نہ ہو۔ جبتک وہ کسی تعزیری قانون کو نفاد میں نہیں لا سکتا جب تک وہ یہ نہ کہلے اور صحیح طور پر نہ کہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا (کسی نفس کو اُس بات کا مُکلف نہیں کیا جائیگا۔ جس کی اسمیں طاقت نہیں یعنی کوئی انسان کسی امر مالایطاق کی تکلیف نہیں دیا جاتا) تب تک لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت کا اعلان نہیں دیسکتا +

مَیں نے تقدیر کے متعلق اپنا عقیدہ تو شروع میں ہی بیان کر دیا۔ میرے نزدیک تو الہام الٰہی بھی دنیا میں حقیقت تقدیر کو ہی کھولنے آیا۔ اصلاح اخلاق کے لئے جن

حقائق تقدیر سے مذہب ہمیں آشنا کرتا ہے۔ اُسی کو شریعت کہتے ہیں۔ جسمانیات کے متعلق جن حقائق تقدیر کو تحقیق ہمارے علم میں لاتی ہے۔ ان کا نام علوم یا سائنس ہو جاتا ہے تقدیر ربّانی اٹل ہے۔ اور اسکی حکومت ناگزیر۔ والقدر خیرہٖ وشرہٖ من اللہ تعالیٰ خُدا کی خلق کی ہُوئی چیزوں میں خیر و شر کے اندازے اسی ذات کے مقرر کردہ ہیں۔ اسی کا نام تقدیر ہے۔ ہر ایک خلق شُدہ چیز کا ایک استعمال مفید ہوتا ہے۔ تو دوسرا استعمال مضر ہے۔ وہ ایک مقدار میں آبحیات کا کام دیتی ہیں۔ تو دوسرے انداز پر زہر ہلاہل ہو جاتی ہے۔ یہ اندازے لاتبدیل اور اٹل ہیں۔ جس وقت کوئی قوت عمل کوئی عضو۔ کوئی خُلق۔ کوئی جذبہ کوئی خواہش۔ الغرض خُدا کی پیدا کردہ کوئی چیز کسی مقدار۔ انداز۔ طریق پر استعمال ہو گی۔ اس کا نتیجہ جو خدا نے مقرر کر رکھا ہے۔ وہ نہیں ٹلیگا۔ اور ہرگز نہیں ٹلیگا۔ کیونکہ وہ تقدیر ربّانی ہے۔ ہاں اگر ان تقدیر کردہ اندازوں کے ماتحت خدا تعالیٰ ہمیں لانا چاہتا ہے۔ اور اُن کے تقاضوں کے مطابق ہم پر جزا سزا مرتب کرنی چاہتا ہے۔ تو اُس پر ہمارا حق یہ ہے کہ وہ ہمیں ان اندازوں کا علم دے۔ اس ہمارے حق کو خدا تعالیٰ نے قبول

کیا - جیسا کہ فرمایا - الذی قدر فھدیٰ - اللہ تعالیٰ وہ ہے
جس نے اندازے مقرر کیئے - پھر ان کے متعلق مخلوق کو
ہدایت کی - یہی وہ اندازے ہیں - کہ جن کی ہدایت شریعت
یا مذہب کرتا ہے - اور یہی وہ فطرت کی تقدیریں ہیں
معاملات جسمانیات میں جن کی دریافت ہم پر چھوڑ دی گئی
انہی تقدیروں کا نام قوانین قدرت ہے - جن کی تدوین
سے علوم اور سائنس پیدا ہوئے - تقدیر نام حدود اللہ
کا ہے - مذہب میں اس کا نام شریعت - اور سائنس میں
انہیں خواص اشیاء یا قوائے فطریہ کہتے ہیں +

جس قدر کسی چیز سے نتائج نیک و بد کا ہمیں یقین
ہوتا ہے - اسی قدر اس کا اثر ہماری قوت عمل پر پڑتا ہے
اگر کسی چیز مثلاً سنکھیا کے متعلق ہمیں یقین کامل ہو
کہ اسکی فلاں مقدار مہلک ہے - تو ممکن نہیں کہ ہم اُسے
چھُو بھی جائیں - اگر ہم کسی گناہ سے بخیال مواخذہ بچتے
ہیں - تو جس قدر ہمیں پکڑے جانے کا یقین ہوتا ہے اسیقدر
ہمارے ارادۂ گناہ میں کمزوری آجاتی ہے - بالمقابل جن
حالات میں ہمیں یقین ہو کہ ہمارے عمل بد کو کوئی دیکھنے والا نہیں
ہماری جُرات گناہ بھی بڑھجاتی ہے - یہی معاملہ حُسنِ عمل
میں بھی ہے کسی چیز یا عمل کے عمدہ نتائج پیدا ہونیکے متعلق

جس حد تک ہمیں یقین ہو گا اُسی حد تک وہ چیز یا عمل ہم اختیار کریں گے۔ الغرض ہر امر میں ہماری قوت عمل ہمیشہ نتائج کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ بعض وقت ہمیں بعض اعمال کے نتائج کے متعلق شُبہ ہوتا ہے۔ تو پھر ہمارے عمل میں بھی لاپرواہی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم لااوبالی کے رنگ میں بعض بدیاں کر گزرتے ہیں۔ صرف اس خیال سے کہ شاید ان سے مشہورہ نتائج ہم پر مرتب نہوں۔ ہم اسیطرح حُسنِ عمل سے اس ہی لئے قاصر ہو جاتے ہیں۔ کہ ہمیں اُس کے نیک نتیجہ پر کامل یقین نہیں ہوتا۔ ورنہ ہم سنکھیا سے کیوں طبعاً بچتے ہیں۔ اور شیرینی کامی کے لئے ہماری نگاہ خود بخود شہد کی طرف کیوں جاتی ہے۔ اسی طرح اگر بعض اعمال بد کے مہلک ہونے کا ہمیں سنکھیا کی طرح یقین ہو اور بعض اعمال کے زندگی بخش ہونے پر آبِ حسنات کی طرح ایمان ہو تو پھر کوئی شیطان ہمیں بدی کی طرف نہیں لیجا سکتا۔ نہ کوئی ابلیس ہمیں حُسنِ عمل سے پھیر سکتا ہے۔ ہمیں ضرورت اسبات کی ہے۔ کہ ہم دو اور دو چار کی طرح یہ یقین کریں کہ اسباب اپنے نتائج پیدا کرنے میں اٹل ہیں۔ فلاں چیز فلاں رنگ میں یقیناً سمِ قاتل ہے۔ اور ویسی

چیز فلاں مقدار میں اور فلاں حالات میں یقیناً مفید ہے۔ تو پھر ہماری قوت عمل کچھ کی کچھ ہو جائیگی۔ ہاں یہ یقین اسی وقت کامل ہو گا۔ جب یہ نیک و بد کے اندازے اس ذات کے مقرر کردہ ہوں۔ جس کو کوئی اور چیز توڑ نہیں سکتی چونکہ انسان کے بتائے ہوئے اندازے ٹوٹ سکتے ہیں اسلئے بعض وقت ہم اُن اندازوں سے انحراف کر جاتے ہیں لیکن خدا سے کوئی بالاتر ہستی نہیں۔ اسکی منشاء کے مقرر کردہ اندازے کون توڑ سکتا ہے۔ اسلئے فرمایا ہے۔ والقدر خیرہٖ وشرہٖ من اللّٰہ تعالیٰ۔ خیر و شر کے اندازے خدا کے مقرر کردہ ہیں۔ وہ ادھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔ جن سے تمسّک کرو گے وہی نتیجہ مترتب ہو گا۔ نیک اسباب نیک ہی ثمرات پیدا کرینگے۔ بد باتیں بد ہی نتائج پیدا کرینگی۔ اسمیں ذرہ بھر خطا نہ ہو گی۔ یہ مسئلۂ تقدیر ہے جو قرآن نے تعلیم کیا ہے۔

اگر تم اپنی طبیعت پر غور کرو کہ تم کسی حسن عمل کے کرنے پر یا عمل بد کے ارتکاب پر جو کسی وقت متامل ہو جاتے ہو تو اسکی اصل وجہ کیا ہوتی ہے؟ اُن کے نتائج کے متعلق تمہارا اطمینان یقین ہوتا۔ نیکی اسلئے نہیں کرتے کہ اسکے نیک ثمرات پر تمہیں شبہ ہے۔ بدی کی طرف اسلئے تمہارا میلان ہوتا ہے۔ کہ اس کے بد نتیجہ کے یقینی ہونے پر

تمہیں تامّل ہے۔ اگر یہ شبہ اور تامل دور ہو جائے۔ اور نیکی کے نیک اور بدی کے بد نتیجہ پر کامل ایمان ہو تو آج بدی جلا وطن اور نیکی کی حکومت دائرہ عمل انسانی میں ہو جائے۔ اس ایمان مطلوبہ کے پیدا کرنے کے لئے مسئلہ تقدیر سکھلایا گیا کہ اسباب اور نتائج کا رشتہ کسی ایسی طاقت کا تجویز کردہ نہیں جس پر کوئی اور طاقت حکمران ہو بلکہ یہ اس کا مقرر کردہ ہے۔ کہ جس کے اندازے مقرر کرنے کا نام ہی قدرت تا ہے۔

خدارا غور کرو۔ کہ وہی مسئلہ تقدیر جو انسان کو ترقی کے چٹان پر چڑھانے کیلئے سکھلایا گیا تھا۔ وہی مسئلہ غلط فہمی سے آج ہماری تباہی کا موجب ہؤا۔ وہی مسئلہ جس سے مرکب عمل میں سرعت قدم پیدا ہونا تھا وہی مسئلہ ہماری ناسمجھیوں سے ہمارے اسپ عمل کو لنگڑا کر دیتا ہے۔

میں نے یہ ابھی لکھا ہے کہ ایمان بر تقدیر ہی کل علوم جدیدہ کی کنجی ہے۔ مادیات میں ہمارا یہ یقین کہ ہر ایک چیز مختلف اندازوں پر اور مختلف حالات میں استعمال ہونے سے مختلف نتائج مُرتب کر دیتی ہے۔ ہماری کُل کی کُل علمی تحقیقات کا محرک ہوتا ہے۔ اگر ان اندازوں کے اٹل ہونے کا ہمیں شبہ ہو تو آج کُل علوم خاک میں ملجائیں ان ہی اندازوں کا دوسرا نام خواص الاشیاء ہے۔ اِن

خواص الاشیاء پر ہمارا ایمان - ہماری علمی تحقیقات کو متحرک کرتا ہے - والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ کسی چیز کا خاص مقدار میں نیک یا بد نتیجہ پیدا کرنا خدا کا بنایا ہؤا ہے اسلئے وہ یقینی ہے قد جعل اللہ لکل شیٔ قدرا ہر ایک چیز کا اندازہ خدا نے مقرر کر رکھا ہے - اگر وہ چیز حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس اندازہ کو معلوم کرو - اور اگر تم نے صحیح اندازہ معلوم کر لیا تو پھر اس چیز کا حصول یقینی ہے - کیونکہ یہی اندازے وہ قانون خداوندی ہیں جو لاتبدیل ہیں - جیسے کہ فرمایا ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا - ان تعلیمات نے قرون اولے کے مسلمانوں کی آنکھیں یکلخت کھول دیں - اور وہ مظاہر قدرت کے متعلقہ مقرر کردہ اندازوں کی دریافت میں لگ گئے پھر قرآن کی اس تعلیم نے ربنا ما خلقت ھذا باطلا (یعنے خدا کی بنائی ہوئی کوئی بھی چیز ہونے سے بے سود نہیں - وہ ہر رنگ میں انسان کے کسی مصرف کی ہے) سونے پر سہاگہ کا کام دیا - پھر کیا تھا علوم کے دروازے کھلنے لگے ایمان بر تقدیر کلید فتوحات ہو گیا - لیکن آج اسی تقدیر کے غلط مفہوم نے کشت عمل پر بجلی گرا دی - ہمارے خرمن کامیابی کو جلا دیا +

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے - کہ یہاں اور آیندہ

بھی ہمارا خیر و شر ہماری عشرت و عُسرت ۔ ہمارا رنج و راحت ہمارے ہاتھ میں ہے ۔ خدا کے تقدیر کردہ اندازے جنہیں اصطلاح میں قانونِ قُدرت کہتے ہیں ۔ ہر وقت کام کر رہے ہیں ۔ اُن کے عمل کو کوئی نہیں روک سکتا ۔ چونکہ یہ قوانین بھی اُسی کے بنائے ہوئے ہیں ۔ اِس لئے علت العلل ہونے کی حیثیت سے ایک طرح کہا جا سکتا ہے ۔ کہ وہی خالق خیر و شر ہے ۔ لیکن اسکی حقیقت یہی ہے ۔ کہ جس وقت ہم اسباب شر پیدا کرتے ہیں تو خدا قوانین شر انگیز سے کام لیتا ہے اور جب ہم اعمال خیر جمع کرتے ہیں تو وہ اپنے خیر افزا قوانین کو عمل میں لے آتا ہے ۔ اندھیرے اور روشنی کو آفتاب کے متعلق کر کے اُس نے یہ قانون بنا رکھا ہے ۔ کہ جو آفتاب کے محاذ و مقابل میں آئے گا وہی روشنی پائیگا اور جو آفتاب سے ادھر اُدھر ہو جائیگا وہ اندھیرے میں ہو گا ۔ اِس قانون کے ماتحت فعل خداوندی بیشک مجھے کبھی نُور اور کبھی ظلمت میں لیجاتا ہے ۔ لیکن فعل خداوندی میرے فعل پر حرکت میں آتا ہے ۔ جس وقت میں اپنے مکان کی کھڑکی بند کرتا ہوں ۔ تو میرے اس فعل پر خدا کا فعل جو مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے ۔ کہ میں اپنے آپ کو اندھیرے میں پاتا ہوں ۔ اِس طرح خدا کی ہر ایک پیدا کردہ چیز میرے لئے موجب رنج و راحت

اور سبب ہدایت وضلالت ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ سب کے سب نتائج میرے اعمال کے اظلال ہوتے ہیں۔ تم خدا کی بنائی ہوئی آگ سے مشینوں کے ذریعہ دنیا جہان کی آسائش و آرام کے اسباب پیدا کر لو۔ یا اسی آگ سے نیرو کی طرح رومہ کو جلا دو۔ آگ ہی تمہاری بہشت و دوزخ بن جاتی ہے۔ لیکن تمہارے عمل کے مطابق +

الغرض خدا کی ہر بنائی ہوئی چیز تمہارے لئے ہدایت اور گمراہی کا موجب ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ وہ چیز خدا کی پیدا کردہ ہے۔ اس چیز کے خواص خدا کے مقرر کردہ اندازوں کے ماتحت خیر وشر یا ہدایت وضلالت پیدا کر دیتے ہیں یا بالفاظ دیگر یہی قوانین خداوندی کسی کو رُو براہ یا گمراہ کر دیتے ہیں تو ان معنوں میں اور اس طریق پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ خدا ہی ہادی اور خدا ہی مضل ہے اور ایسا ہی اسکی ہر ایک بنائی ہوئی چیز ہادی اور مضل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ضلالت اسی وقت خدا کی طرف سے ہم پر مرتب ہوتی ہے۔ جب ہم اس کے مقرر کردہ حدود خیر کو توڑتے ہیں۔ اس حقیقت کو کس قدر صفائی کے ساتھ قرآن کے یہ الفاظ ظاہر کر دیتے ہیں۔ یضل بہ کثیرا ویھدی بہ کثیرا وما یضل بہ الا الفاسقین۔ اسی سے لوگ ہدایت

پاتے ہیں۔ اور اسی سے گمراہ ہوتے ہیں مگر گمراہ وہی ہوتے ہیں جو پہلے فسق کرتے ہیں۔ یعنی قانون خداوندی کو توڑتے ہیں۔ گویا خدا کی طرف سے ہدایت وضلالت اس کے تبلائے ہوئے قوانین کے ماتحت ہمارے قانون توڑنے پر دارد ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کل کے ہلانیوالے ہم خود ہیں۔ اگر ایسا نہوتا تو پھر عمل کی کوئی حاجت نہ ہوتی۔ نہ قانون کی کوئی عزت رہتی۔ نہ حدود کا کوئی لحاظ ہوتا۔ اگر ہماری ترقی حدود مقررہ کے اندر چلنے پر منحصر ہے۔ اور یہ وہ امر ہے کہ جس پر ایک دہریہ کا بھی ایمان ہے۔ اور جس کی شہادت کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ تو ہم میں پاسداری قوانین کا کامل جذبہ پیدا کرنے کے لیے یہ قوانین الٰہیہ بھی نہایت ہی سخت اور اٹل ہونے چاہئیں۔ جس وقت کوئی شخص قانون سے ذرہ بھر بھی ادھر ادھر ہو وہ فی الفور اُس حد تک تکلیف یا ضلالت میں پہنچا دیا جائے۔ اسی طرح اگر وہ اس حالت سے نکلنا چاہے تو صرف حدود قوانین میں ہی آنے پر ایسا ہو۔ یعنی خدا کے قوانین پر ہی چلکر وہ ہدایت پائے۔ اور اس طرح خدا اور صرف خدا ہی اسکا ہادی ہو بالمقابل جب خدا یا اس کا قانون کسی انسان کو حدود ہدایت سے باہر ہونے پر میدان ضلالت میں کھڑا کر دے۔ تو پھر اس حالت سے

اس کا نکلنا بھی خدا اور اس کے قوانین کے بغیر نہ ہوسکے
جب تک اس حقیقت کا ایمان کامل نہ ہو تب تک نہ کسی
قانونِ الٰہی کی عزت ہوسکتی ہے۔ اور نہ کوئی ترقی مُرتب
ہوگی۔ اسی لئے شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر خطبہ
اور وعظ کا آغاز جن مقدّس الفاظ سے کیا۔ اور ہمیں ایسا
کرنیکی ہدایت کی اسمیں یہ الفاظ ہم بطور تنبیہ و تحریص پاتے
ہیں فمن یھدی اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ
فلا ھادی لہ۔ جس کو خدا نے ہدایت دی اُسے کون گمراہ
کرسکتا ہے۔ اور جس کو خدا نے ہدایت سے نکالدیا پھر
اُسے ہدایت کون دے؟

ایک ہدایت تو وہ ہے جو ہمیں راستہ دکھلانے آتی
ہے۔ ہماری ناواقفی میں ہمیں آکر علم دیتی ہے ہمیں بتلاتی
ہے۔ کہ ہم کدھر جائیں اور کدھر نہ جائیں۔ اِس ہدایت
کو قرآن نے ھدیً کہکر پکارا ہے (ھدی من ربھم)
یہ فیض رحمانیت سے دُنیا میں آتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا
الرحمن علم القرآن یعنے نزول قرآن فیض رحمانیت ہے
یعنی یہ وہ ہدایت ہے جو انسان کے کسی بھی قدم کے اُٹھانے
سے پہلے اُس کے سامنے ہوتا ہے۔ چلنے کی ضرورت
پیدا ہونے سے پہلے ہمیں ایک صحیح راہ کے علم کی ضرورت

ہے۔ اس قسم کی ضرورتوں کا دفعیہ کرنا جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ خدا کی صفت رحمانیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اِنسان کا خدا پر حق ہے۔ کہ اگر خدا تعالیٰ اِنسان کے چلنے کے لئے کوئی راستہ تجویز کرے۔ جس راستہ پر یا اس سے ادھر اُدھر ہونے پر انسان کی ہدایت یا ضلالت منحصر ہے۔ اور پھر اِنسان کو قوت تمیز دے کر اس کو انتخاب راہ کی طاقت بھی دے۔ تو پھر جہاں ایک طرف خدا پر انسان کا حق ہے۔ کہ وہ اِنسان کی رہنمونی کے لئے اِنسان کو قوت ارادی و تمیز کے عطیہ کے ساتھ ہی ایک دستورُ العمل بھی دیدے۔ وہاں انسان کے مقابل خدا کو بھی حق پہنچتا ہے۔ کہ انسان کو ان عطیات دینے کے بعد انسان کے اپنے قدم اُٹھانے کے مطابق اس پر اچھے یا بُرے نتائج مرتب کرے۔ یہ حقیقت مسئلہ تقدیر کی ہے۔ ہم نے ان اوراق میں مفصل بحث کی ہے۔ کہ فیض رحمانیت قوی انسانی کی آبیاری کے لئے از خود آتا ہے۔ لیکن اس فیض کے بعد رحیمیّت اور مالکیّت اِنسان کے عمل کے مطابق اپنا رنگ دکھلاتی ہے۔ اگر عطیات رحمانیت کو اِنسان صحیح طور پر استعمال کرے تو مفید نتائج۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو شان مالکیت جزاو سزا کے عمل کو اس پر وارد کر دیتی ہے۔ اِن حقائق ثلاثہ سے

ایک دہریہ مگر پرستار قانون بھی انحراف نہیں کر سکتا۔
اِن حقائق کی روشنی میں تم اگر مسئلہ تقدیر اور مسئلہ ہدایت و ضلالت پر غور کرو گے تو تم پر ان مسائل کا سمجھنا بہت آسان ہو جائیگا۔ فیضِ ربوبیت نے تمہیں قوت عمل عطا فرمائی۔ اور قوتِ عمل کی حکمرانی کے لئے تمہیں قوتِ آزادی بخشی۔ اپنے ارادہ سے چلنے کی طاقت دیکر تمہیں جہاں ایک طرف اچھی یا بری راہ میں تمیز کرنے کی طاقت دی وہاں اُسی قوتِ ارادی کی رہنموئی کے لئے ایک ہدایت نامہ بھی دیدیا۔ اور یہ سب کچھ تمہارے کسی قدم کے اٹھانے سے پہلے ہوا۔ باغ کا دروازہ آدمؑ پر کھولنے سے پہلے لا تقربا ھذہ الشجرۃ کا نقش فطرتِ آدمؑ میں ثبت کر دیا۔ یہ سب کچھ فیضِ رحمانیت سے ہوا۔ اب اِن حقائق بالا کو اگر ہم اپنے سامنے رکھیں تو ہدایت نامہ کے آجانے کے بعد رحیمیت اور مالکیت کے تقاضے انسان کے قدم عمل کے پیچھے پیچھے آنے چاہئیں۔ اگر وہ مشعل ہدایت کی رہنموئی کے مطابق ایک قدم اٹھائیگا تو اس کا وہی قدم اس کے لئے دس اور سو مشعل ہدایت ہو جائیگا۔ تم اپنے ذہنی اور دماغی قویٰ کو دیکھ لو۔ آج اگر تمہارا ذہن صحیح راہ پر چلکر ایک بات سمجھنے کے قابل

ہوگیا ہے۔ توکل تم از خود دس باتیں سمجھ لوگے لیکن اگر تم
مشعل ہدایت سے ایک قدم ادھر ہوئے تو اسی قدر راہ
دیکھنے میں تمہاری آنکھ کی روشنی کم ہوگی۔ اب جوں جوں
یہ قدم مقام نور ہدایت سے دور ہوتا جائیگا۔ اور ایسا
ہونا تمہاری رفتار معکوس کا نتیجہ ہوگا۔ اسی نسبت سے
ظلمت بڑھتے بڑھتے تم اسی مقام پر پہنچ جاؤگے۔ جہاں
آنکھ ہوتے ہوئے کچھ نظر نہ آئیگا۔ اسی طرح اگر آوازِ ہدایت
سے تم دور چلے گئے تو تمہیں کان ہوتے ہوئے کچھ
سنائی نہیں دیگا۔ قد صدق اللہ تعالیٰ لھم قلوب
لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا و
لھم اذان لا یسمعون بھا اولئک کالانعام بل
ھم اضل اولئک ھم الغفلون۔ آنکھ ہوتے ہوئے
یہ نہیں سنتے دل ہوتے ہوئے یہ غور نہیں کرتے گونگے ہیں
بہرے ہیں۔ جس مقام ہدایت سے اب یہ دور ہو چکے ہیں
وہاں واپس نہیں آسکتے۔ یہ اندھیرے میں تھے۔
انکی رہنمونی کے لئے آگ جلائی گئی۔ یہ اس آگ سے
گھبرا کر بھاگے۔ کیونکہ ان کی روشنی میں ان کے عیوب
ظاہر ہونے لگے تھے۔ جوں جوں روشنی تیز ہوئی اسیقدر
یہ اور بھاگے۔ ان کے ہر قدم وحشت پر خدا ان سے نور دو

کرتا گیا یعنی نور تو اپنے مقام پر قائم ہے لیکن چونکہ کسی کا
مقام نور سے دور چلا جانا خدا کے بنائے ہوئے قانون کے
مطابق انہیں نابینا کرتا ہے۔ تو اس حقیقت پر زور
دینے کے لئے شانِ کبریائی اُسے اپنی طرف منسوب کرتی
ہے۔ یعنی خدا نور لیجاتا ہے۔ اور اس طرح انہیں نابینا
کردیتا ہے۔ یہ حقیقت ہے ان آیات کی جہاں قرآن
لوگوں کا گونگا بہرہ یا اندھا ہونا بیان کرتا ہے اور جس
سے قوت عمل کے دشمن مسئلہ تقدیر کا غلط انعام مفہوم
نکالتے ہیں۔ مثلهم کمثل الذی استوقد نارا ج
فلما اضاءت ما حوله ذهب الله بنورهم وترکهم فی
ظلمت لا یبصرون ۰ صم بکم عمی فهم لا یرجعون
مقام ہدایت سے اُن منحرف ہونیوالوں کی مثال یہ ہے
کسی نے اُن کے لئے آگ جلائی (انہوں نے اس مقام سے
بھاگنا شروع کیا۔ اور اتنی دور پہنچ گئے کہ) جب آگ
جلانیوالے (پیغمبر) کے اردگرد کافی روشنی ہوگئی تو ان
بھاگنے والوں سے خدا روشنی لیگیا۔ انہیں اندھیرے
میں چھوڑ دیا گیا۔ جہاں اُنہیں کچھ نظر نہیں آتا (ایسا
ہی انہوں نے اور اپنے دیگر قوی کی رہنمونی کی بھی پرواہ
نہ کی) وہ گونگے بہرے اور اندھے ہو گئے (اُن کے

تو ہی اب ایسے مر گئے کہ) اب وہ اس مقام سے واپس نہیں آسکتے (تباہی کی بجلی ان پر آپڑی - کڑک سُن کر وہ گھبرائے۔ اس کڑک کی دہشت سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ڈالیں - نادان نہیں جانتے کہ بجلی کی آواز بجلی کے گرنے کے بعد آیا کرتی ہے - وہ لاکھ کانوں میں اُنگلیاں دیں برق ہلاکت اپنا کام کر گئی -

او کصیب من السماء فیہ ظلمٰت ورعد و برق یجعلون اصابعھم فی اٰذانھم من الصواعق حذر الموت واللہ محیط بالکافرین ۱۔ ان کی مثال تو یہ ہے کہ اب سخت بارش پڑ رہی ہے جس میں کڑک بھی ہے - اب یہ کڑک سے موت کے ڈر کے مارے کانوں میں انگلیاں دے رہے ہیں لیکن خدا تو پہلے ہی ان پر محیط ہو چکا ہے +

آہ ! واحسرتا !! یہی آج مسلم کی حالت ہے - مسلمانوں کی ہدایت کے لئے قرآن نے آگ جلائی مسلمانوں نے اس سے انحراف کیا - ان کے قوٰی دن بدن مضمحل ہوتے گئے - ان کے اعضاء آہستہ آہستہ مرتے گئے - مرض موت غالب آتا گیا - یہ اندھے تھے اس لئے نہ دیکھ سکے مصلحین نے شور ڈالا مرثیئے پڑھے - یہ بہرے تھے - یہ کب سُن سکتے تھے - آہستہ آہستہ ان کے اعصاب مسلوب

ہوتے گئے۔ فقدان عمل نے اُن کی قوتیں زائل کرنی شروع کردیں۔ ان کے اعضاء ان کے جسم سے جھڑنے لگ گئے۔ آج ٹیونس۔ کل الجیریا۔ ہنگری۔ بوسینیا۔ وسط ایشیا۔ غرض آج ہاتھ کٹا کل پاؤں کٹا لیکن صُمٌّ بُکمٌ عمیٌ فھم لا یرجعون کے ہم مصداق تھے ہمیں کچھ سمجھ نہ آئی۔ کچھ تھوڑی سی بینائی اور شنوائی باقی تھی کچھ جان سسک رہی تھی۔ یوُرپ کا بیمار موت کو بُلا رہا تھا

او کصیب من السماء فیہ ظلمٰت و رعد و برق

۲۳ جولائی ۱۹۱۴ء کو ایک گھٹا سی اُٹھی۔ خطرناک بادل بنگئے۔ کڑک اور بجلی کی شکل میں ہمارے ارد گرد موت منڈلانے لگی۔ ہمنے کبھی آنکھ بند کی۔ کبھی کانوں میں انگلیاں دیں۔ یہ ہمارا شور و شر حمایت خلافت میں بجلی کی کڑک پر کانوں میں انگلیاں رکھنا نہیں تو اور کیا ہے۔ فتویٰ خداوندی واللہ محیط بالکٰفرین۔ ہم کافر قوم۔ کافر رسولؐ۔ کافر خدا ہیں۔ ہم سے خدا نے وہی سلوک کیا۔ جو مجرمین اور ظالمین سے کیا کرتا ہے۔ ہم لاکھ کانوں میں انگلیاں دیں۔ آواز آنے سے پہلے صاعقہ موت کا کام ہو چکتا ہے۔ ان اعمال پر خلافت کو جانا تھا چلی گئی۔ تم یہ کہو گے کہ ہماری خلافت کسی کی بد عہدی کا شکار ہوئی۔ کسی کے ظلم نے ہمیں ہلاک کیا۔ یہ

بھی صحیح ہوگا لیکن تم قرآن کو دیکھو ظالم کن پر مسلط کئے جاتے ہیں؟ دیکھو قرآن کریم کیا کہتا ہے۔

وکذالك نولی بعض الظلمین بعضاً بما کانوا یکسبون (الانعام)

مانا کوئی ظالم ہے۔ لیکن اگر تؤتی الملك صحیح ہے۔ تو پھر خدا جن پر ظالم مسلط کرتا ہے وہ تم ہو۔ تم نے دوسروں کو ظالم ٹھیرا کر اپنی حیثیت سے بھی ہمیں اطلاع دیدی ہے۔ اور ساتھ ہی اپنا علاج بھی بتلا دیا وہ تبدیلئے حیثیت ہے۔ اب اگر تمہاری موجودہ جدوجہد سے وہ حیثیت بدل سکتی ہے تو بسم اللہ ورنہ اس حیثیت کو بدلنے کی کوشش کرو کہ جس کے کسی قوم میں پیدا ہوجانے پر خدائیتعالی ان پر ظالم مسلط کر دیتا ہے + انسان کو خدا صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ کر کے نہیں بھیجتا بلکہ انسان خود اس حالت تک پہنچ جاتا ہے۔ ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ (اللہ تعالیٰ ان کے دل اور کان پر مُہر لگا دیتا ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈالدیتا ہے) سے وہ مراد نہیں جو ایک عمل کا چور پرستار تقدیر بمفہوم مشہورہ بن کر اپنی بدعملیوں کے جواز میں بول اُٹھتا ہے۔ کہ ہم خدا کی طرف سے ایسے

ہی بنائے گئے ہیں۔ وہ خود اپنی بدکرداریوں سے اور پند و نصائح سے مُنہ موڑنے سے آہستہ آہستہ اپنے قوے کو مسلُوب کر کے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ انکی طاقتیں خدا کے قانون پاداش عمل کے ماتحت ہمیشہ کے لیئے زائل ہو جاتی ہیں اور ان پر مُہر لگ جاتی ہے۔ یہ فعلِ خداوندی ہے۔ جس کا صدور ہماری پیدائش سے پہلے نہیں ہوتا جیسے بدعملوں نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ یہ فعل خداوندی ہمارے عمل سے حرکت میں آتا ہے یہ میری تشریحات تفسیر بالرّاے نہیں بلکہ قوی پر مُہر خداوندی لگنے کا طریق اِسی طرح پر خود قرآن نے بیان کیا ہے جیسے کہ فرمایا ہے:

اذا جاءك المنافقون قالو نشهد
انك لرسول اللہ واللہ یعلم انك
لرسولہ واللہ یشهد ان المنفقین
لکذبون ٥ اتخذو ایمانهم جنة
فصدو عن سبیل اللہ انهم ساء ما
کانو یعملون ٥ ذلك بانهم آمنوا
ثم کفروا فطبع علے
قلوبهم فهم لا

جب منافق تیرے پاس آتے ہیں اور تیری رسالت پر
شہادت دیتے ہیں۔ خدا بھی جانتا ہے کہ تو رسول
ہے لیکن خدا یہ بھی شہادت دیتا ہے کہ منافق
جھوٹے ہیں۔ وہ اپنی قسموں کو اپنی سپر بناتے
ہیں۔ خدا کی راہ سے دُور چلے جاتے ہیں
جو کرتے ہیں یقیناً بُرا کرتے ہیں انکی وجہ یہ ہے
کہ کبھی وہ ایمان لے آتے ہیں کبھی وہ چھوڑ دیتے
ہیں۔ پھر اس کے باعث ان کے دلوں پر

يفقهون ٥ اولم يهد للذين يرثون الارض من بعد اهلها ان لو نشاء اصبنٰهم بذنوبهم و نطبع علےٰ قلوبهم فهم لا يسمعون ٥ ثم بعثنا من بعده رسلا الی قومهم فجاءُوهم بالبينٰت فما كانوا ليومنوا بما كذبوا به من قبل كذالك نطبع علےٰ قلوب المعتدين واذا انزلت سورة ان امنوا بالله وجاهدوا مع رسوله استاذنك اولوا الطول منهم وقالوا ذرنا نكن مع القعدين رضوا بان

مہر لگجاتی ہے۔ اور انکی سمجھ ماری جاتی ہے +
یہ جو دوسری نسل کے لوگ پہلی نسل کے بعد زمین کے وارث ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ نہیں سمجھتے کہ ہم ان کو (بھی) ان ہی غلطیوں کے باعث اگر چاہیں تو تکلیف دیں۔ اور ان کے دلوں پر مہر کر دیں۔ پھر یہ سننے کے قابل نہیں رہیں گے +
نوحؑ کے بعد ہم نے اور رسول اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے۔ انہوں نے کھلے دلائل سے باتیں سمجھائیں لیکن چونکہ وہ پہلے ہی جھٹلا چکے تھے اسلئے انہوں نے ان سچوں کو نہ مانا۔ یہی وہ مُہر ہے جو ہم حدود سے متجاوز ہونے والوں کے دلوں پر لگا دیا کرتے ہیں +
جب کبھی کسی سورت نے نازل ہوکر انہیں حکم دیا کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور رسول کے ساتھ کھڑے ہوکر سعی تام کرو تو ان میں کے صاحب استطاعت لوگ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں کہ ہمیں یہاں ہی چھوڑ جا۔ ہم پیچھے رہینگے۔ اب انہوں نے یہ پسند کیا ہے

یکونوا مع الخوالف وطبع علی قلوبھم فھم لا یفقھون٥	کہ وہ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ رہیں تو خدا بھی اُن کے دلوں پر مُہر کر دیتا ہے وہ سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتے ۔

ایسے ہی مطالب کو لئے ہوئے قرآن میں چند اور آیتیں بھی ہیں۔ ان سب کا منشاء یہی ہے۔ کہ انسان کی اپنی بدعملی اُن الٰہی قوانین کو حرکت کرتی رہے جن سے مُہر مسلوبیت انسانی قوی پر لگ جاتی ہے۔ آیات بالا میں بھی چند ایسی باتوں کا ذکر ہے۔ مثلاً منافق آج ایک بات مان لیں کل اس سے انکار کر دینگے۔ ظاہر ہے کہ اس سے قوت فعل زائل ہو جائیگی۔ اسی طرح جب نصائح ربانی پر ہم کان نہیں دھریں گے۔ ہماری شنوائی بیکار ہو جائیگی۔ اسی طرح جن لوگوں میں دوسروں کو جھٹلانے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس پرانی عادت کے باعث وہ ہر ناصح ربانی کی تکذیب پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ خدائی باتیں سُننے کے قابل ہی نہیں رہتے بعض لوگ کسی اصُول کو مان کر بھی اپنی اس قسم کی حالت کر لیتے ہیں۔ جب کسی ربانی غرض کے پُورا کرنے میں کسی کوشش کی ضرورت پڑی تو دُنیا کو دین پر مقدم کرنیوالے اس کوشش سے جان چُراتے ہیں۔ اور اس طرح حقیقت

کے سمجھنے کی طاقت آہستہ آہستہ اُن سے زائل ہو جاتی ہے یہی وہ مُہرِ خداوندی ہے جو انسانی قویٰ کو اُن کے ہوتے ہوئے بیکار کر دیتی ہے۔ اب یہ سمجھ لینا کونسا مشکل ہے کہ بعض لوگ کس طرح اور کن حالات میں کان ہوتے ہُوئے نہیں سُننے آنکھ ہوتے نہیں دیکھتے۔ بہتر ہو کہ اس وقت مسلمان قرآن کو کھول کر ان آیات پر غور کریں۔ جو اس مُہر کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ آیات مندرجۂ بالا کے علاوہ چند اور آیتیں بھی ہیں۔ جن میں امُور مذکورہ بالا کے علاوہ بعض چند اور باتوں کا بھی ذکر ہے۔ جن کے انسان میں ہونے پر خُدا کی طرف سے مُہرِ مسلُوبیت قویٰ لگجایا کرتی ہے۔ ہم میں آج جو خیرِ عمل کی طاقت نہیں رہی۔ اور ہمارے قویٰ مُہر زدہ ہو چکے ہیں۔ اگر ہم اس حالت سے نکلنا چاہتے ہیں تو پھر ان آیات پر غور کریں۔ اور ان کے مطابق اپنی اصلاح کریں +

منکرینِ صداقت میں سے بدترین حالت اُن لوگونکی ہوتی ہے جو اپنے آپ کو نصیحت سے مستغنی سمجھتے ہیں اُنہیں ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہوتا ہے۔ وہ نصیحت کی طرف رُخ ہی نہیں کرتے۔ یہ نہایت ہی خطرناک حالت ہے جس کا نقشہ ہماری عبرت کے لئے سب سے اوّل قرآن نے ان الفاظ

میں کھینچا ۔ ان الذین کفروا سواءٌ علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون ۔ ختم اللّٰہ علےٰ قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم ۔ جو کافر ایسے ہوں انہیں خواہ ڈراؤ خواہ نہ ڈراؤ وہ مانیں گے ہی نہیں ۔ ایسوں کے دِلوں پر کانوں پر مُہرِ خُداوندی لگجاتی ہے ! اور آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے ۔ اُن کے لئے عذاب عظیم ہی ہے ۔ یہ حقیقت ہے ۔ اِس سے اِنکار نہیں ہو سکتا نصیحت تو اُسے مفید ہوگی ۔ جو کسی کی پند پر کان دھریگا ۔ کسی مقامِ عبرت پر وہ آنکھ ڈالیگا ۔ جسمیں کوئی خشیت ہو لیکن جِس کے لئے ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہو اُس کا دِل آنکھ کان ہونا نہ ہونا سب برابر ہیں ۔ اس پُر صد افت آیت کے کیا اُلٹے معنی نادانوں نے کر لئے ہیں ۔ کہ جو کافر ہیں ۔ اُن کو ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے وہ نہیں مانینگے ۔ خدا نے اُن کے کان اور دِل پر مُہر لگا دی ہے ۔ اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے ۔ یہ آیت تو قرآن کے پڑھنے والے کو یہ اطلاع دیتی ہے ۔ کہ وہی اِنسان دُنیا میں فائدہ اُٹھاتا ہے ۔ جسمیں کسی قسم کا خوف ہوتا ہے جو حدُود و خوف سے نِکلجاتا ہے ۔ وہ ناقابلِ اصلاح ہو جاتا

ہے۔ اِس صداقت سے کون اِنکار کر سکتا ہے۔
قرآن کے ان حقائق پر کائنات شہادت دیتی ہے مثلاً
انسان کے اِرد گِرد جو کچھ بھی پیدا ہوا ہے وہ اسکی بہتری
کے لئے ہے۔ لیکن اِس کی اپنی ہی اچھی یا بُری استعداد
اس چیز کو اس کے لئے مفید یا غیر مفید کر دیتی ہے ٹھنڈی
ہوا اور ٹھنڈے پانی سے ایک صحیح مزاج فائدہ اُٹھا سکتا
ہے۔ لیکن جس کے پہلے سے ہی پھیپھڑے خراب کئے ہوئے
ہے۔ اس کے لئے یہ دونوں چیزیں زہر قاتل ہو جائینگی
مرض تو پہلے ہی سے موجود ہے۔ اب اگر ان اسباب سے
جو ایک صحیح مزاج کی تندرستی کے لئے ضروری ہیں وہ ایک
مریض کی مرض کو اور بڑھا دے تو کچھ عجب بات نہیں یہی
صورت اخلاق اور رُوحانیات کے معاملہ میں بھی ہوتی ہے
جو صحیح مزاج کی رُوحانی غذا ہوتی ہے۔ وہ روحانی مریض
کے مرض کو اور بڑھا دیتی ہے۔ اور ان سب کے لئے خدا
کے یہاں سے قوانین مقرر ہیں جن کی رُو سے خدا ایک
کی غذا کو دوسرے کے لئے زہر کر دیتا ہے۔ فی قلوبھم
مرض فزادھم اللہ مرضا۔ مرض تو پہلے ہی سے تھا
طبیعت میں نخوت تکبّر اور ان کے متقاضی عادت انکار
و تکذیب تو پہلے ہی سے موجود تھی۔ اب ایک مصلح ربّانی

کے پیدا ہو جانے پر یہ مرض اور بڑھیگا +

آسمان سے بارش آتی ہے۔ لیکن اُس کے ذریعہ کسی زمین کے ٹکڑے سے وہی کچھ نکلتا ہے جو اسمیں پہلے سے موجود ہے۔ ہاں کسی کی کوشش اصلاح پذیر زمین کو بارش سے صحیح طور پر مستفید ہونے کے قابل بھی کر دیتی ہے۔ یہی قلوب کیحالت ہے۔ الہام ایک بارش کی طرح آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ جس سے بعض وقت بعض نفوس سے نہایت ہی پلید خباثتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے الفاظ ذیل میں بیان فرمایا ہے۔ جس سے نادانوں نے تقدیر کے اُلٹے معنے کئے +

واللہ انزل من السماء ماءً فاحیا بہ الارض بعد موتہا +

اب اگر قرآن نے اپنے متعلق یہ کہہ دیا۔ کہ یضل بہ کثیراً و یھدی بہ کثیراً (بعض اس سے ہدایت پکڑیں گے۔ بعض اس سے گمراہ ہونگے) تو وہ تو ایک صداقت فطریّہ کا اظہار کیا۔ اور ساتھ ہی وما یضل بہ الا الفٰسقین کہہ کر وہ اسباب بھی بتادیئے جن کے ہوتے ہوئے رحمت زحمت ہو جایا کرتی ہے۔ اور اسباب خیر وشر کو بڑھاتے ہیں +

یہ حقیقت مسئلۂ تقدیر کی ہے۔ ہمارے قارئین پر یہ بات کھل جائے گی۔ کہ مسئلۂ تقدیر ایک معملۂ ترقی انسانی ہے زمانہ نے اسکے سمجھنے میں بڑی بڑی ٹھوکریں کھائیں۔ اس کی حقیقت نہ سمجھنے نے کروڑ ہا مخلوق کو تباہ کر دیا۔ دُنیا فیٹلزم کی قائل ہو کر اُس کے بدنتائج سے مصیبت میں پڑ گئی۔ قرآن نے نازل ہو کر اُسکی حقیقت سے دُنیا کو آشنا کیا۔ مسئلہ تقدیر کو اس کے قائمقام پیش کیا لیکن ناوانوں نے فیٹلزم اور مسئلہ تقدیر کو ایک کر دیا۔ اسلام سے پہلے یہ مسئلہ ہدایت وضلالت ایک معمۂ لاینحل رہا۔ ہاں قرآن نے آکر اس گتھی کو سُلجھایا۔ خدا اس شعر کے مصنف پر اپنا خاص رحم فرمائے۔ اور مکروہات سے بچائے۔ جس نے ایک امر واقع اِن الفاظ میں بیان کیا ؎

جو فلسفیوں سے حل نہ ہُوا اور نکتہ وروں سے کھُل نہ سکا
وہ رازِ اِک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

یہ سب مصیبت اوّل قرآن اور اس کے بعد عربی زبان کی ناآشنائی سے پیدا ہوئی ہے۔ تقدیر کے معنے عربی زبان میں اندازہ مقرر کرنے کے ہیں و القدر خیرہٖ وشرہٖ من اللہ تعالیٰ میں تو یہ تعلیم دیگئی ہے کہ خدا تعالیٰ

نے خیر وشر کے اندازے مقرر کردیئے ہیں - ان کو سامنے رکھ کر اکتساب خیر وشر کر لو - اس سے یہ کہاں پایا جاتا ہے - کہ اس نے ایک کے لئے خیر اور دوسرے کے لئے شر پہلے سے مقرر کردیا +

اسی طرح لفظ ہدایت وضلالت کے حقیقی معنوں سے ناآشنائی نے خدا کو بعض کی نگاہ میں ہمارا گمراہ کرنیوالا بنا رکھا ہے - بیشک خدا کے متعلق لفظ مضل بولا گیا ہے - مضل کے ایک معنے گمراہ کرنیوالا ہے لیکن یہ لفظ مصدر اضلال سے نکلا ہے - جس کے معنے کسی کو گمراہ ٹھیرانا بھی ہے - یعنے کسی کے حالات گمراہی پر محاکمہ کر کے اس پر فتوے ضلالت دینے کا نام بھی اضلال ہے - چنانچہ ذیل کے شعر سے یہ بات پائی جاتی ہے ؎

مازال شربی الراح حتی اضلنی
صدیقی وساءنی بعد ذلکا

یہاں اضلنی صدیقی کے معنی یہ نہیں کہ میرے صدیق نے مجھے گمراہ کیا بلکہ مجھے گمراہ ٹھیرایا ہے - یعنے میرے بعض حالات اس کے محاکمہ کے مطابق ضلالت ہیں - بعض وقت کسی قانون کے لفاذ سے پہلے بعض باتیں جرم میں داخل نہیں ہوتیں لیکن نفاذ قانون انہیں جرم

بنا دیتے ہیں۔ شب زفاف ایکٹ کے نفاذ سے پہلے کوئی شخص ایک بارہ سالہ سے کم سن لڑکی کو نکاح میں لا کر تکمیلِ زوجیت کر سکتا تھا۔ لیکن نفاذ ایکٹ کے بعد یہ فعل جرم ہو گیا۔ یہی حال شریعت خداوندی کا ہے اس کے نزول سے پہلے جن بعض افعال پر حد شرعی وارد نہ ہو سکتی تھی۔ اور وہ اب گناہ ہو جاتے ہیں۔ شراب ایک وقت تک جاری رہی۔ لیکن ممانعت ہو جانے سے شراب کا پینا گناہ ہو گیا۔ اِس طرح خدا کی کتاب نازل ہو کر کسی کو ہدایت پر اور کسی کو ضلالت پر کھڑا ہُوا ٹھیراتی ہے۔ یعنی بعض افعال کا نام جن میں بعض لوگ نزولِ کتاب سے پہلے ہی آغشتہ ہوتے ہیں۔ وہ ضلالت رکھتی ہے۔ اِس طرح اس کتاب کی شان میں یضل بہٖ کثیرًا و یھدی بہٖ کثیرًا کہا جا سکتا ہے لہٰذا خدا کا مضل ہونا کسی فیٹلزم کو ثابت نہیں کرتا۔ ایک جج کے سامنے ایک مُلزم آتا ہے۔ اس کے خلاف تفتیش شروع ہوتی ہے عندالتفتیش اُسے کوئی مجرم نہیں کہہ سکتا۔ مگر جب اس کی ذات سے بعض ایسے افعال کا صادر ہونا ثابت ہو جائے۔ جو کسی قانون نافذالوقت کے ماتحت جرم بن جاتے ہیں تو جج اس کو

جرم کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے۔ اسی شخص کو جسے اس فیصلہ سے پہلے کوئی مجرم نہ کہہ سکتا تھا۔ آج جج کی قلم اور زبان مجرم بنا دیتی ہے۔ جہاں یہ بات صحیح ہے کہ جج نے اس سے کوئی جرم نہیں کرایا۔ اور نہ اسے مجرم بنایا۔ وہاں یہ کہنا بھی صحیح ہے۔ کہ جج نے ہی اس کے افعال گذشتہ کو جرم ٹھیرا کر اسے مجرم بنایا۔ اسی طرح سے خدا کو مضل بھی کہا گیا ہے +

میں نے اس بحث میں اس مسئلہ کے اس پہلو کو چھوڑ دیا ہے۔ جس کا تعلق بعض افراد کے ان معاصی و مصائب سے ہوتا ہے۔ کہ جن کے ظہور میں ان کا بذاتہٖ یا تو بہت کم حصہ یا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی کا کسی مصیبت زدہ یا بدکردار گھر میں پیدا ہونا یا پیدائشاً بعض کمزوریوں کو ساتھ لانا۔ ان معاملات کو براہ راست تعلق مسئلۂ تناسخ سے ہے جہاں انشاء اللہ مسئلہ تقدیر کا یہ پہلو بھی قرآنی روشنی میں زیر بحث آجائیگا۔ یہاں طوالت نے ہمیں اجازت نہیں دی +

مسئلۂ تقدیر و مسئلۂ ہدایت و ضلالت جس روشنی میں قرآن نے پیش کئے وہ دراصل قوت عمل کی ہی اہمیت کے لئے بیان ہوئے۔ مسئلۂ تقدیر نے یہ سمجھا دیا

کہ نہ تو نفع و نقصان پہلے ہی سے تقسیم میں آچکا ہے
نہ اُن کا پیدا ہونا ایسے اسباب سے تعلق رکھتا ہے
جنمیں ثبات و قیام نہیں۔ قرآن نے تعلیم دی ہے۔ کہ
یہی راہیں لا تبدیل ہیں۔ اور ان کے طریق مستقل طور پر معین
ہیں۔ ان پر چلنے والا کسی دُبدا میں نہیں رہ سکتا۔
وہ قدم اُٹھانے سے پہلے معلوم کر سکتا ہے۔ اور ایسا
کرنے کیلئے دروازے کھلے ہیں۔ کہ جس راہ پر اس نے
قدم اُٹھایا ہے۔ اسکی آخری منزل نفع ہے یا نقصان
مسئلۂ تقدیر کی ان دو حقیقتوں کو ایمانی رنگ میں اگر انسان
سامنے رکھے یعنے نہ تو نفع نقصان کی تقسیم پہلے سے
ہو چکی ہے۔ نہ اُن کی راہیں غیر یقینی ہیں۔ تو پھر
قوّت عمل کے سوا اور کیا رہجاتا ہے۔ عمل سے ہی ہر قسم
کا نفع کسی کے قبضہ میں آجاتا ہے۔ اور بے عملی
یا بدعملی سے ہی انسان کے قدم اُسے مقام خسران تک
پہنچا دیتے ہیں۔ اسی قوت عمل پر انسان کا ایمان
مضبوط کرنے ایساہی طاقت عمل کو بڑھانے اور عمل کو
صحیح راہ پر لگانے کے لیے قرآن کریم نے مسئلۂ ہدایت و
ضلالت کی اصلی حقیقت بیان کردی۔ ہدایت سے مُراد
قدم عمل کا مضبوط ہونا اور اس کا صحیح راستہ پر چلنا ہے

اور ضلالت سے مُراد یہاں نہ صرف قوت عمل کا غلط قدم اُٹھانا ہے - بلکہ اس کا کلیتہً مفقود ہونا ہے - اِن دو باتوں کے سمجھانے کے لئے ایک طرف تو یہ کہ دیا کہ ہدایت و ضلالت کی تقسیم پہلے ہی سے نہیں ہو چکی - ہاں ان کے انداز پہلے سے مقرر ہیں - تمہارا اپنا ہی عمل تمہیں صحیح یا غیر صحیح راہ پر لیجائیگا - اور تمہاری رہنموئی کے لئے صحیح علم تمہارے قبضۂ قدرت میں رکھ دیا گیا ہے ساتھ ہی تمہیں یہ بھی بتلا دیا گیا ہے - کہ کن کن باتوں کے اختیار کرنے سے قوّت عمل مسلوب ہو جاتی ہے - یہ وہ باتیں ہیں - کہ جن کی تشریح کے بعد قرآن کہتا ہے - کہ انسان میں اس حالت کے پیدا ہونے پر خدا تعالےٰ اسکی آنکھ یا کان یا دل پر مُہر لگا دیتا ہے - یعنی اسکے قوی حالتِ جمُود میں آجاتے ہیں - اس صورت میں یہ سمجھ لینا کہ بعض انسان پہلے ہی سے ایسے ہوتے ہیں اجتماع ضدّین ہے - ایک طرف قوّت عمل کی موجودگی - اور دوسری طرف اُن کی حالتِ جمُود پر یقین + اِن بداعتقادیوں کے دُور کرنے کے لئے اور انسان کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ ہر ایک شخص کی استعداد بھی بر وقت پیدائش صحیح ہوتی ہیں - اسمیں قوت عمل موجُود

ہوتی ہے۔ اسکے سامنے یکساں طور پر نفع و نقصان کے راہ کھلے ہوتے ہیں۔ یہ کہ دنیا میں آتے سے پہلے ہی اس کا قدم گمرہی کے راستہ پر قضا و قدر کی طرف سے رکھ دیا جاتا ہے یا اسمیں چلنے کی طاقت ہی نہیں رکھی جاتی۔ بلکہ جس طرح جسمانی طور پر علی العموم ہر بچّہ کے پاؤں میں چلنے کی طاقت۔ صحیح راہ دیکھنے کی استعداد اور تمیز غلط یا صحیح راہ پر چلنے کا اختیار سب کچھ اسے حاصل ہے۔ ایسا ہی اخلاق۔ روحانیات اور معاملات عقلیّہ میں بھی مبداءِ فیاض نے یہ چاروں باتیں ہر بچّۂ انسان کے لئے بطور حقوق پیدائش مقرر کر دی ہیں۔ یعنی قوّت عمل اور اس سے صحیح طور پر استعمال ہونے یا نشو و نما پانے کے لیے جو ضروریات ہیں وہ ابنِ آدم کو پیدائشاً دیگئی ہیں۔ اس ساری حقیقت کو کن مختصر اور پیارے الفاظ میں دُنیا کے سچّے محسن علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان کیا ہے کہ انسان کا ہر ایک بچّہ پیدا ہونے پر مسلمان ہوتا ہے۔ بعد میں اس کا ماحول کچھ کا کچھ اُسے بنا دیتا ہے۔ اسلام کے معنے قوانین الٰہیّہ کو تسلیم کرنا اور ان پر عمل کرنا ہے۔ ان راہوں سے ادھر اُدھر ہوتا ہی کسی کو غیر مسلم بناتا ہے۔ اب کون بچّہ ہے جسمیں پیدائشاً یہ استعداد نہیں ہوتی۔ ان

مُقدّس الفاظ نے فیٹلزم کا ستیاناس کر دیا۔ فیٹلزم یعنی
اِنسان کے اختیار میں کچھ نہیں۔ اس کے لئے جو کچھ
ہونا ہے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ کسی ایسے مذہب کی تعلیم
میں نہیں آسکتا۔ جو یہ تعلیم دے کہ ہر ایک بچہ مسلمان
پیدا ہوتا ہے۔ فیٹلزم پیدائش اِنسانی سے پہلے خیر و شر
کی تقسیم تجویز کرتا ہے۔ اور اِسی تقسیم کے ماتحت
اِنسانوں کا پیدا ہونا بتلاتا ہے۔ اس سے دُنیا میں
عمل کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک فیٹلسٹ دراصل
اپنے معتقدات کا بطلان کرتا ہے۔ اگر وہ کسی قسم کا
عمل و حرکت کرے۔ بالمقابل جس مذہب نے کُل بنی نوع
کا ایک ہی طرح پر پیدائشًا صاحبِ استعداد ہونا تجویز
کر لیا۔ جیسا کہ اِس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ فیٹلزم
کا قائل نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ جو اِسلامی مسئلۂ تقدیر
کو فیٹلزم کا مُترادف سمجھے ہُوئے ہیں۔ اور جن کی
تردید میں ہم مفصّل بحث کر آئے ہیں۔ وہ اِس
مُتفق علیہ حدیث پر غور کریں۔ مُسلم ہونا تو دراصل
احکامِ الٰہیّہ کو تسلیم کرنا اور اُن پر عمل کرنا ہے۔ اور یہ
بات ہر ایک میں اِستعدادًا موجود ہے۔ اب اگر اسلام
ایک بڑی سے بڑی نعمت ہے۔ اور غیر اسلامی حالت ہی

ایک خطرناک چیز اور بدترین ضلالت ہے تو یہ حدیث ان کے عقائد فاسدہ کو خاک میں ملاتی ہے۔ اس نے تو صاف ظاہر کردیا۔ کہ ہر ایک بچّہ کو پیدائشاً وہ بڑی سے بڑی نعمت ملجاتی ہے۔ اور وہ بروقتِ پیدائش ضلالت پر نہیں ہوتا
دراصل سب سے بڑی دولت انسان کے لئے یہی ہے
کہ اس کے قوےٰ صحیح ہوں۔ اس کے قوےٰ میں کامل قوت عمل ہو۔ قدم عمل کو صحیح طور پر اٹھانے کے لئے نیک یا بدراہ کا علم و تمیز یکساں طور پر عطا ہو جائے۔ نتائج عمل سب کے لئے برابر ہوں۔ تو پھر کسی کا دولتمند کے یہاں پیدا ہونا یا افلاس زدہ گھر میں آنا۔ سب عوارض ہی عوارض ہیں جو دُور ہو سکتے ہیں۔ ایک کروڑ پتی کے بیٹے کا نانِ شبینہ سے محتاج ہو جانا۔ اور ایک بچۂ افلاس کا زرومال کو روندنا۔ ان سوسائیٹیوں میں ایک معمولی واقعہ ہے جہاں قوتِ عمل کی حقیقت سے لوگ آشنا ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ افلاس اور دولتمندی کوئی اتنی بڑی چیز نہیں ہے جس کی بحث از پیدائش تقسیم انسان کی راہ میں حارج ہو۔ شکمِ مادر سے جو جو چیزیں یکساں طور پر بچّے لاتے ہیں وہی اصل سرمایہ ہے۔ ایک طرف انسانوں کا ایک ہی قسم کے قوےٰ لے کر آنا۔ دوسری طرف مخبرِ صادقؐ کا

نسل انسانی کو یہ خوشخبری سُنانا ۔ کہ ہر ایک انسان کے آگے صحیح راہ کھُلی ہے ۔ اسمیں صحیح راہ کی تمیز اور اس پر چلنے کی استعداد پیدائشاً موجود ہوتی ہے ۔ یعنی ہر بچہ پیدائشاً مُسلمان پیدا ہوتا ہے ۔ اِن دو صد اقتوں نے عقیدۂ فیٹلزم کو تباہ کردیا ✣

اگر اس مسئلہ کی تنقید کیجائے ۔ تو اُس کے پرستار مُسلمان تو نہیں ۔ بلکہ عیسائی اور تناسخ کے ماننے والے ٹھیرتے ہیں ۔ جس شخص نے یہ تسلیم کرلیا ۔ کہ اُسکے اس جنم کے اچھے یا بُرے حالات اس کے گذشتہ جنم کا نتیجہ ہیں ۔ اور اس کے گذشتہ اعمال کے اٹل نتائج ہیں ۔ تو پھر وہ فیٹلزم کا پرستار ہے ۔ اِسی طرح جو مذہب نجات کو عمل سے وابستہ نہیں کرتا ۔ بلکہ کسی بات کے ماننے پر یا بالفاظِ دیگر کسی عقیدہ پر ایمان رکھنے سے وابستہ کرتا ہے وہ بھی فیٹلزم کا ماننے والا ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ عیسائی غیر عیسائی گھروں میں بچّے پیدا ہوتے ہیں ۔ کثرت سے بچے قوت فہم تک پہنچنے سے پہلے مرجاتے ہیں ۔ عیسائی اور غیر عیسائی گھر میں پیدا ہونا جیسے کسی کے اختیار میں نہیں ویسے ہی پیش از سنِ فہم موت کے ماتحت عیسائی یا غیر عیسائی مذہب پر مرنا بھی اس کے اختیار سے باہر ہوگا ۔

اِسطرح بعض بچّے نجات کے لئے اور بعض بچّے جہنّم کے لئے شکمِ مادر سے آئے ہیں۔ یہ فیٹلزم نہیں تو اور کیا ہے یہ جو عیسائی گھر میں بچّے کے پیدا ہونے پر ہی بپتسمہ کی فی الفور فکر کیجاتی ہے۔ اسکی بھی وجہ یہی ہے۔ کہ اگر پیدا ہوتے ہی اس کو بہت جلد مرجانا ہے تو بپتسمہ اُسے جہنّم سے تو بچا لے لیکن ان بچّوں کا کیا حشر ہوگا جو ہر قسم کی کوشش پر بھی آدمی چھوڑ موٹر اور ایروپلین کے بھیجنے پر بھی پادری کے آنے سے پہلے مرجائیں۔ اگر نجات بپتسمہ سے وابستہ ہے تو یقیناً وہ جہنّمی ہے۔ چنانچہ بہت تھوڑا عرصہ گذرا ہے۔ کہ رُوس میں ایک عیسائی فرقہ تھا جو ایسے بچّوں کو عیسائی قبرستان میں دفن نہیں کرتے تھے جو بلا بپتسمہ مرجاتے تھے۔ عیسائی عقائد کے ماتحت ایسے بچّوں کا وقف نارِ جہنّم ہونا ایک لازمی منطقی نتیجہ تھا اِسلئے وہ رُوسی فرقہ خُدا کے فعل کو اسی جگہ شروع کردینا تھا۔ یعنی وہ ایسے بچّوں کو آگ میں ڈالدیتے تھے۔ اُن کا ایسا کرنا بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ مذہب کلیسیہ کے ماتحت یہی ہونا چاہئے۔ مسئلۂ کفّارہ کے ماننے پر یہ سب باتیں نتیجۃً انسان کو ماننی پڑتی ہیں۔ مبارک ہے وہ اِنسان جس نے اِس لعنتی نتیجہ کی بجائے دنیا کو انجیلِ عمل عطا فرمائی۔

اور ہر ایک ایسے بچے کو نجات کی خوشخبری دی۔ جو قوت عمل کے صحیح طور پر استعمال کرنے کی عمر سے پہلے اِس جہان سے رخصت ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ کہیں پیدا ہو اور اسکے والدین کے معتقدات کچھ ہی ہوں +

کیا خدا کی شان ہے کہ اِس مسئلہ تقدیر میں بھی مسلمان تو عیسائی اور آریہ بنگئے۔ اور آریہ اور عیسائی مسلمان ہوگئے۔ وہ فیٹلسٹ ہونے پر پرستار عمل ہیں۔ یہ جنہیں عمل پر قائم کیا گیا فیٹلسٹ بنکر قوائے عمل کو جواب دے بیٹھے +

بشارتِ عظمےٰ

اِنْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

اگر ایک جملہ میں انجیل عمل کا لُبِّ لباب آسکتا ہے تو وہ مُقدّس جملہ قرآن کے مذکورہ بالا الفاظ ہیں یوں تو ان میں انذار کا رنگ ہے لیکن یہ وہ انذار ہے جو تبشیر کی جان ہے حکم تو یہ ہے کہ کوشش کے سوا انسان کو کچھ نہ ملیگا لیکن اِس ارشاد کے ساتھ ان مطالبات کی حد بندی بھی کردیگئی جن کے پُورا ہونے پر ہم اجرِ جزیل پائیں گے ہمیں خوشخبری دیگئی ہے۔ کہ نہ صرف تمہاری کوشش ہی

ہی ضائع نہ ہوگی - بلکہ کوشش پر جو ملیگا اسکا کوئی حساب نہیں
وان سعیہ سوف یری ثم یجزیٰہ الجزاء الاوفیٰ۔
الغرض ان آیات نے جہاں ہمیں ان بے انداز
خیر وبرکت سے اطلاع دی ہے جو بارگاہ خداوندی نے ہمارے
لئے خاص کردی ہے - وہاں ان کے مقابل وہ بے بضاعت
سرمایہ بھی ہمیں بتلادیا - جو اس فلاح موعودہ کے حصول کیلئے
انسان نے بہم پہنچانا ہے - اور وہ الفاظ بالا کی رو سے صرف اسکی سعی و
کوشش ہے - یہ کس قدر فضل خداوندی ہے - کہ وہ بیحد وحساب
خزائن جن کی قیمت کے لئے کروڑوں اشرفیاں بھی کچھ حقیقت
نہیں رکھتیں - اور جو انسان کے ہر قسم کے سامان وآسائش کیلئے از بس
ضروری ہیں - وہ چاروں طرف کھلے پڑے ہیں - اور
انسانی کوشش پر اس کے قبضہ اور ملکیت میں آجاتے ہیں
جیسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے نہ ہمیں کسی سرمایہ
کی ضرورت ہے - نہ ہمیں منافعہ کی طرف سے کوئی جوکھوں
نہ یہ فکر ہے - کہ کس پونجی سے کام کریں - نہ یہ خطرہ ہے - کہ
ہماری کوشش کس ٹھکانہ لگے - فضل خداوندی نے جو بات
ہمارے ذمہ ڈال دی - وہ صرف ایک کوشش ہے - کس قدر
قرآن کریم نے نازل ہوکر نسل انسانی پر فضل کیا - اسکی ہر آسائش
اور اسکی ہر خواہش کا پورا ہونا ایک ایسی چیز سے وابستہ ہونا بیان

کردیا جو اس کے ہر فرد میں موجود ہے۔ جس کے لئے وہ نہ کسی کا رہین منت نہ کسی کا محتاج امداد ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور اُن کا صحیح استعمال ہی اس کا سرمایہ ہے۔ اور جس مواد پر اس کے ہاتھ پاؤں کی کوشش نے خرچ ہوتا ہے۔ وہ اس کے ہاتھ پاؤں کی طرح پہلے ہی سے اس کیلئے موجود ہے۔ وہ کسی انسان نے نہیں پیدا کر رکھا کہ جس کا حصول کسی منت خوشامد محنت یا قیمت کو چاہتا ہو۔ وہ فیض رحمانیت نے بلا بدل پہلے ہی سے ہر انسان کے لئے پیدا کر رکھا ہے۔ پھر ایک کام کرنیوالے کے لئے کس قدر اطمینان بخش یہ وعدۂ خداوندی ہے۔ کہ ہم (لا نضیع اجر المصلحین) کسی کے عمل کو خواہ وہ ایک رائی کے برابر ہو ضائع نہیں کرتے۔ بلکہ فیض رحیمیت سے کئی گنا نتائج حسنٰی مرتب کر دیتے ہیں۔ کسی کو اپنے محنت کے ثمرات حاصل کرنے میں نہ کسی سفارش کی ضرورت ہے نہ فدیہ و رشوت کی حاجت ہے نہ ہمارے یہاں منت و خوشامد کی پرواہ نہ یہاں کسی کے واسطہ و وسیلہ کی احتیاج تمہاری محنت کے نتائج یقینی ہیں۔ صرف تمہارے ہاتھ ہلانے کی دیر ہے۔ ہم غاصب بھی نہیں۔ نہ صرف کسی کی محنت کا حق ہی ہم اپنی طرف نہیں رکھتے۔ بلکہ ثمرات

عمل کے مُرتب کرنے میں ہم سریع الحساب ہیں۔ عمل کے ساتھ ساتھ ہم نتائج عمل مرتب کرتے ہیں +

جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے نہ صرف الفاظ رحمٰن ورحیم کے ہی مفہوم میں یہ سب کچھ آجاتا ہے۔ بلکہ میرا فقرہ فقرہ قرآنی آیات کا ترجمہ ہے۔ اب اگر کسی کو قرآنی صداقتوں پر ایمان ہے تو اس کے لئے یہ کسقدر عظیم الشان خوشخبری ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان کیلئے اور کیا موجب تکلیف ہوسکتا ہے کہ اس کو ما یحتاج کیلئے کسی اور کی طرف دیکھنا پڑے۔ ایسا ہی اس سے زیادہ اس کے لئے اور کیا گھبراہٹ ہوسکتی ہے۔ کہ اسے اپنے ثمر محنت کے متعلق کسی قسم کا دُبدا ہو۔ مگر ان سب باتوں سے خُدائے قرآن نے انسان کو آزاد کردیا۔ حتےٰ کہ اپنی ذات کو بھی اس امر میں الگ کردیا۔ سرمایہ کے طور پر جو انسان کو دینا تھا۔ وہ بلا طلب ہر ایک کو دیدیا۔ اور اسے یقین دلادیا کہ یہ عطیہ اس سے واپس نہیں لیا جائیگا عمل کے نتائج اٹل کرکے اپنی مشیت کو بھی دخل نہ دینے دیا۔ اور یہ اعلان کردیا۔ کہ اگر ہماری مشیت اسمعاملہ میں کام کریگی تو ثمرات محنت کے کئی گُنا عطا کرنے میں نہ کہ ثمرات کے صائع کرنے میں۔ ان حقائق پر غور کرو۔ اور

دیکھو کہ ایک مُردہ بھی ان سے زندہ ہو سکتا ہے۔

خودداری و خود اعتمادی جو بہترین اخلاق فاضلہ میں سے ہے ایک کامیاب اِنسان کے لئے ازبس ضروری ہے۔ بلکہ ہم یہ بھی کہ سکتے ہیں۔ کہ جو عظیم الشان اِنسان ادنٰے سے ادنٰے طبقہ سے نکل کر اپنی زندگی میں ہی اعلےٰ سے اعلےٰ مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ اُن کا اصلی جوہر یہی خودداری اور خود اعتمادی تھی۔ بڑے سے بڑا لشکر فتحمندی کا مُنہ نہیں دیکھ سکتا۔ بے انداز دولت کسی مُہم کو کامیاب نہیں بنا سکتی۔ الغرض ہر قسم کے اسبابِ ضروریہ جن کے ہوتے ہُوئے نصرت و فتحمندی ایک امر حاصل شُدہ سمجھنا چاہئے۔ یہ سب کی سب چیزیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی مُہم کے اصلی کارندے میں خودداری اور خود اعتمادی نہ ہو۔ اِنسانی فطرت میں یقینی طور پر اگر یہ دو جوہر پیدا ہو سکتے ہیں۔ تو پھر ان چند باتوں پر ایمان رکھنے سے جو ہم نے بیان کی ہیں۔ جو حاجتیں خودداری کا خون کرنیوالی ہیں۔ وہ اس شخص کو تکلیف نہیں دے سکتیں جو رحمانیت پر ایمان رکھتا ہے۔ سطح ایسی کسی محنت کے ثمرات کے متعلق شک و اشتباہ جو رُوح خُود اعتمادی کو کمزور کر دیتا ہے۔ وہ رحمانیت کے پرستاروں

میں پھٹکتا تک بھی نہیں +

بعض وقت مجھے حیرت آتی ہے۔ کہ اگر اسلام ہمیں یہ زندگی بخش فرمودات نہ سناتا تو پھر دُنیا میں اِنسان کو کسی مذہب کی ضرورت کیا تھی؟ الھام اگر بعض ایسے حقائق کے اِنکشاف کے لئے آتا ہے کہ جس سے اِنسان کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اور اسکی زندگی قابلِ زیست ہو جائے تو پھر وہ یہی حقائق ہیں۔ کہ جن کا پتہ اگر کہیں کما حقہٗ ملا تو قرآن کے پہلے صفحہ پر جہاں ان امور کو نہایت ہی دھندلے طریق پر کتبِ سابقہ نے بیان کیا۔ وہاں اُسے مبرہن کرنے میں بسم اللہ الرحمن الرحیم جیسے مختصر جملہ نے آفتاب کا کام دیا۔ میں بعض وقت خیال کرتا ہوں۔ کہ اگر کتبِ الٰہیہ۔ صفاتِ الٰہیہ کے سمجھانے کے لئے آتی ہیں۔ کہ تا اِنسان اپنے حالات کو ان صفات کے تقاضات کے مطابق بنائے۔ اور یہ وہ لطیف **فلسفہ** ہے۔ جو قرآن نے ہی آکر دُنیا کو سمجھایا چنانچہ قرآن نے صفاتِ الٰہیہ کے مطابق حال ہونے کا نام حسنات اور ان کے خلاف چلنے کا نام سیئات رکھا۔ اب اگر یہ امرِ واقع ہے تو میرے نزدیک کتب سابقہ اپنی موجودہ شکل میں اِن مطالبات کو پُورا نہیں کرتیں +

اب مجھے مسلمان بھائیوں سے کچھ عرض کرنا ہے۔ اگر اور قومیں ان صداقتوں کی طرف توجہ نہ کریں تو کچھ ہرج نہیں تمہارا تو قرآن پر ایمان ہے۔ تم تو ان بیش بہا صداقتوں کو اسلام کی فضیلت میں پیش کیا کرتے ہو تو پھر عملاً تمہارا قرآن پر ایمان کیوں نہیں؟ اگر ہم خدا کو رحمٰن اور رحیم سمجھتے ہیں تو پھر تشریحات مندرجۂ اوراق ہذا کی رو سے ہمارا یہ ایمان بھی ہونا چاہیئے کہ ہماری ہر ضرورت کے دفعیہ کے اسباب ہر جگہ ہمارے ارد گرد بلا قیمت بطور عطیۂ ربی ہر جگہ موجود ہیں۔ ہماری کوششیں انہیں جمع کرسکتی ہیں۔ اور ہمارا عمل انہیں مطلوبہ شکل دے سکتا ہے۔ کیا ان امور کے ہوتے ہوئے کوئی مومن دنیا میں ذلت اور مسکینی دیکھ سکتا ہے۔ جو آج ہمارے حصہ میں آچکی ہے؟ اس میں شک نہیں کہ بعض وقت یہ عطیہ جات ربی ہماری غفلت سے دوسروں کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں۔ جو پورے طور پر ہمیں ان ربانی خزائن سے متمتع ہونے نہیں دیتے۔ بدقسمتی سے آج کل کی بعض گورنمنٹیں بھی اس طرح کرتی ہیں۔ اپنی قیام طاقت کا راز وہ ایک قوم کی طاقت بڑھانے میں اور دوسروں کی تضعیف میں سمجھتی ہیں اسلئے وہ بعض جگہ محکوم حصۂ رعایا کو خزائن قدرت کے

استعمال کرنے کا موقعہ نہیں دیتیں۔ یہ غلط پالیسی ہے اور کوئی ملمع سازی اِن بیہودہ حکمت عملیوں کو چھپا نہیں سکتی۔ اس سے ایک نہ ایک دِن نقصان ہی نقصان ہوگا۔ جو اسباب ترقی و آسائش جس مُلک میں خوُد رحمٰن نے پیدا کر رکھے ہیں۔ اس سے اس ملک کے باشندوں کو کوئی گورنمنٹ کیوں روکے۔ اس میں حاکم و محکوم دونوں کا نقصان ہے۔ لیکن مادیّت پرست اِنسان اِن ربّانی حقائق کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ کسی نہ کسی طریق سے ایک ملک پر قابض ہو جاتا ہے۔ پھر اسی مُلک کے باشندوں کو اس ملک کے فطرتی خزائن سے متمتع ہونے نہیں دیتا۔ اور اسطرح اس سلطنتِ خُداوندی میں خلل ڈال دیتا ہے جس کا انتظام خدا کی صفات رحمٰن و رحیم کر رہی ہیں ؎

جس آسمانی بادشاہت کے زمین پر آنے کی دُعا جناب مسیحؑ مانگ رہا تھا۔ اس کا چارٹر قرآن تھا جس میں اس بادشاہت کے اصوُل مندرج ہیں۔ وہ دُنیا میں کچھ عرصہ کے لئے قائم بھی ہوئی۔ یعنی بعثتِ اِسلام پر۔ لیکن اِنسان ابھی اس ربّانی سلطنت کے اصوُل سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ بیس تیئیس سال کے عرصہ کے بعد ہی اُن اصوُلوں سے انحراف شروع ہوگیا۔ امیر مُعاویہ نے

نے عیسائی ہمسایہ سلاطین کے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر
اُس بادشاہت کے ایک زبردست اصول یعنے انتخاب خلیفہ
کو توڑا - بات یہ ہے کہ اس ربّانی سلطنت کے اصُول
تو آنحضرت صلعم نے سکھلا دیئے - ان پر اپنی قوم کو چلا کر
وہ سلطنت بھی قائم کر دی - اور زمانہ نے دیکھ بھی لیا
کہ محمّدی تعلیمات مسیح کے مواعظ کی طرح خوابہائے بیداری
نہیں - بلکہ حقائق اور قابلِ عمل صداقتیں ہیں مگر جیسے
میں نے اوپر بیان کیا ہے - ابھی انسان ان اصولوں
کے سمجھنے اور ان کی قدر دانی کے قابل نہ ہوا تھا اسلئے
مسلمان اُس پر کچھ عرصہ کے بعد پُورے طور پر چل نہ سکے
ہاں یہ رنگ تھوڑا بہت ہمیشہ مسلم سلطنتوں میں رہا
وہ طرزِ حکومت جو قرآن نے پیش کی - اور جس کے زمین پر
قائم ہونے کی مسیح نے دُعا کی - وہ جمہوری سلطنت کی بہترین
شکل ہے جس کی کما حقّہٗ کیفیات کا بیان کرنا ایک الگ مستقل کتاب
چاہتا ہے - یہاں میں اسقدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں - کہ وہ سلطنت
اپنے اندر اس خدا کی حکومت کا رنگ رکھتی ہے - جو دُنیا میں
رب العٰلمین کی حکومت ہے جسمیں رنگ و قوم ملک و زبان کی تمیز نہیں
ہوتی جسمیں مملکت محروسہ کے خزائن طبعیہ ہر ایک انسان کے واسطے
کھلے ہوتے ہیں جسمیں ان خزائن کے سنبھال کی اہلیت ہوتی ہے وہاں یہ

نہیں ہوتا۔ کہ رعایا کا ایک حصّہ ان خزائن کے استعمال کرنے میں ہر قسم کی آسانیاں حاصل کرے۔ اور دوسرے حصّہ رعایا کی راہ میں قسم قسم کی دقتیں پیدا کی جائیں۔ گذشتہ جنگ کے ایک نہایت ہی آڑے وقت میں جب اتّحادی اپنے اِردگرد تباہی دیکھ رہے تھے۔ لائیڈ جارج کے مُنّہ سے غالباً جون ۱۹۱۸ء میں بمقام گلاسگو دوران تقریر میں ایک فقرہ نکل گیا۔ وہ جسمیں اس آسمانی بادشاہ کے صحیح خط و خال تھے۔ جن کا حوالہ میں نے اِن سطور میں دیا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے "ہماری سلطنت مسیح پر لائبل ہے" (یعنی اسکی تعلیم کے نذیل شان ہے) ...." ہر ایک مُلک ہر ایک اِنسان کے واسطے ہونا چاہئیے"۔ بیشک وہ زمین جسے ربّ العالمین خدا نے پیدا کیا۔ وہ اسکی ہر ایک مخلوق کے لئے کُھلی ہونی چاہئیے۔ اور وہ خزائن جو رحمٰن نے پیدا کئے ان پر اس کی مخلوق میں سے ہر ایک ایسا ہاتھ پہنچنا چاہئیے جو ان سے فائدہ اُٹھانے کے لئے مستعد ہو جائے[۱]۔ لائیڈ جارج کی گورنمنٹ پر وہ ایک نازک وقت تھا۔ عالم مایوسی میں اس کے مُنہ سے یہ فقرہ نکل گیا۔ اور غالباً

[۱] اس ملک جادہ میں جہاں میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اس ربانی سلطنت کا محدود شکل میں ایک رنگ مجھے نظر آیا ہے۔ ہر ایک جائداد کی کسی مین کو بلا حوالہ گورنمنٹ اپنے قبضہ تصرف میں لا سکتا ہے جو اس سے پہلے کسی اور کے زیرِ عمل نہ آ چکی ہو +

اس مصیبت کے وقت ایک سچّے دل سے نکلا تھا۔ وہ منشاء ایزدی کے مطابق تھا۔ خدا کی جناب میں وہ عاجزی پسند آگئی۔ آناً فاناً واقعات نے صورت پلٹی۔ اتحادیوں کی فتح ہو گئی۔ آج اس پر ڈھائی سال گذر گئے۔ زمانہ منتظر ہے۔ کہ برطانیہ کے وزیر اعظم کو اپنے الفاظ کی عزّت کرنے کا کب موقعہ ملیگا +

میں کسی قدر اپنے موضوع سے دُور چلا گیا ہُوں مطلب میرا صرف اسی قدر ہے۔ کہ خزائن رحمانی ہمارے اردگرد موجُود ہیں۔ اگر بالفرض موجُودہ حالات اُن کے استعمال میں کچھ رُکاوٹیں ڈالیں تو مضائقہ نہیں وہ خزائن اِس قدر لاانتہا ہیں کہ قوّت عمل انہیں آج ہی ہماری فلاح کا موجب بنا دیگی۔ مسلمانوں کے پاس اگر دولت نہیں تو نہ سہی۔ اگر سرمایہ نہیں تو نہ سہی۔ اگر اسباب و سامان ضروریہ نہیں ہیں تو نہ سہی۔ اگر انہیں صرف قوت عمل موجود ہے۔ اگر وہ ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھ۔ کان۔ دل و دماغ کو استعمال کرنے کی فکر میں ہو جائیں۔ وہ ہمت باندھیں کُل دُنیا ان کا وطن ہے

ارض اللہ واسعۃ

کا پیغام انہیں دیا ہے۔ سیروا فی الارض انہیں کتاب حمید کہہ رہی ہے۔ پھر انہیں کیا فکر ہے۔ میری مُراد اس سے وہ

نادان حرکت نہیں ہے جس کا نام مسلمانوں نے پچھلے دنوں غلط طور پر ہجرت رکھا۔ ہجرت ایک مقدس اور پاک جذبہ ہے کاش ہم اسکی حقیقت سے آشنا ہوتے۔ کاش وہ کیفیت ہمارے دل و دماغ میں پیدا ہو جاتی۔ وہ تو فتح و نصرت کی کنجی ہے۔ اسکی اہمیّت اسی سے ظاہر ہوتی ہے۔ کہ ہمارے سنہ کا ہی نہیں بلکہ ہماری فتح و نصرت کا آغاز اُس سے ہوا ہے۔ ہجرت کے قواعد پر میں بہت جلد ایک رسالہ اسی سلسلہ میں لکھنے والا ہوں۔ یہاں میری مراد صرف اسی قدر ہے کہ تم اپنے ملک میں ہی رہو اور جہاں چاہو جاؤ۔ مگر قوتِ عمل کو ساتھ لے کر۔ یہ وہ خداداد سرمایہ ہے جس کے سامنے روپیہ پیسہ شیلنگ۔ پاؤنڈ ٹھیکریاں ہیں جس جگہ تم رہو جہاں تم رہو۔ تمہارا ماحول ہی تمہارا خزانہ ہے۔ اگر تم میں قوتِ جاذبہ موجود ہے۔ درختوں کو دیکھو مختلف قسم کے درخت مختلف غذائیں اپنی نشوونما کے لئے چاہتے ہیں۔ تم بیشک مختلف اقسام و اجناس کے درختوں کو ایک ہی چار دیواری میں جمع کر لو۔ اگر انہیں قوت عمل موجود ہے تو وہ اپنی اپنی مختلف غذا وہیں سے حاصل کر لیں گے۔ اور اپنے وقت پر پھل دیجائینگے۔ ہاں جس وقت ان میں سے کسی میں قوت جاذبہ کم ہو جائیگی۔

وہی ماحول جو اس کے نشوونما کا موجب تھا اس کیلئے بیکار ہو جائیگا۔ تم اپنے جسم کو ہی دیکھ لو۔ اگر اس کے مختلف اعضاء میں قوّتِ عمل موجود ہے۔ تو تم کہیں رہو کوئی غذا کھاؤ۔ وہ تمہارے لئے صحت بخش اور طاقت افزا ہو جائیگی۔ مگر جب تم کسی غلط کاری سے یا طبعاً کھولت سے قوائے ہضمیہ کا عمل کھو بیٹھے ہو تو پھر بہتر سے بہتر آب وہوا کا مقام اور مقوّی سے مقوی غذا تمہیں نفع رساں نہ ہوگی تبدیلیٔ مقام و غذا بھی اُسی کو مفید ہوتی ہے جس کے قویٰ میں قوّت عمل موجود ہوتی ہے۔ بیشک بعض مقام دلدلوں یا کسی اور مضر صحّت اسباب کے پیدا ہو جانے پر رہائش کے قابل نہیں رہتے۔ اُن کا چھوڑنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اب تمہیں مسئلۂ ہجرت سمجھ آئیگا۔ **ہجرت کے معنے مقام کی تبدیلی نہیں۔** ہجرت کی رُوح کسی درخت یا کسی جسم کی قوت مدبرہ کا وہ پہلو ہے۔ جس کے ذریعہ وہ جسم کو مضر نمو چیزوں سے اضطراراً بچاتی ہے۔ یہ قوّت یعنے قوّت دفع شر ہر ایک نمو پانے والی چیز میں فطرتاً موجود ہے۔ تمہیں بحیثیت انسان نموے خلق بھی کرنا ہے۔ تربیتِ اخلاق میں رُوح ہجرت وہ کام دیگی۔ جو کسی قسم کے نمو میں قوّت

دفع شر کا کام دیتی ہے۔ تبدیلیٔ مقام کرنے سے پہلے رُوحِ ہجرت پیدا کرو۔ القیام فی ما اقام اللہ کو مت بھولو۔ اگر تمہارا مقام دلدلوں اور زہریلے مواد سے بھر گیا ہے تو تبدیلیٔ مقام ضروری ہے لیکن یہ تبدیلیٔ مقام بھی اسی کو مفید پڑیگی جسمیں رُوحِ ہجرت موجود ہو۔ یہ موقعہ نہیں کہ میں اُس سے زیادہ تفصیل سے مسئلۂ ہجرت پر کچھ اور لکھوں۔ جو چاہے ہماری کتاب مہاجرت کا مُطالعہ کرے۔ مجھے یہاں صرف اِسی قدر کہنا ہے۔ کہ رُوحِ ہجرت قوّتِ عمل کا ایک ممتاز پہلو ہے۔ اور وہ ہم میں موجود نہیں۔ ایک تھوہر کے درخت کو تم ہندوستان سے لیجا کر افغانستان میں لگا دو۔ وہ تھوہر کا ہی پھل دیگا۔ اس میں سیب اور انگور تو نہیں لگ جائیں گے۔ میرے نزدیک عملاً اور اخلاقاً ہندوستان میں نہ ابھی وہ دلدل پیدا ہوئے ہیں۔ نہ اس قسم کے زہریلے مواد جمع ہوئے ہیں۔ جِس سے شجرِ اخلاق و عمل کے نمو میں فرق آئے۔ جِس نخل میں قوّتِ ایصالِ خیر اور قوّتِ دفعِ شر موجُود ہے۔ اور یہی دو پہلو قوتِ عمل کے ہیں۔ جس کی طرف میں ابھی اشارہ کر رہا تھا۔ تو وہ نخل اِس ہندوستان میں افغانستان یا

کسی اور ملک کے مقابل اب بھی بدرجہا بہتر پھولنے پھلنے کے اسباب پاسکتا ہے۔ میں اس جماعت کے بعض افراد سے واقف ہوں۔ جو پچھلے دنوں لباسِ مہاجرت پہن بیٹھے تھے۔ میں نے ارادۃً لباس کا استعارہ استعمال کیا۔ کیونکہ وہ کالائے دیگراں تھا۔ اُن کے اندام اس خلعت فاخرہ کے موزوں ہی نہ تھے۔ افغانستان جاکر بھی سیب اور انگور کے درخت ہی پھل دے سکتے تھے۔ ببول۔ آک۔ سرکنڈا۔ یا گھاس افغانستان چھوڑ کر۔ اگر بالفرض جنّت میں ہی چلے جائیں تو اپنی فطرت کو ساتھ لیجائیں گے۔ بلکہ یہاں تو وہ کسی مصرف کے لئے کچھ پیدا بھی کرتے تھے۔ وہاں اجنبی آب و ہوا اور نئے ماحول کے باعث اپنی خلقت بھی گنوا بیٹھینگے یہ میں نہیں کہتا۔ بلکہ خود خدا کہتا ہے ومن کان فی ھٰذہٖ اعمیٰ فھو فی الاٰخرۃ اعمیٰ واضل سبیلا۔ خدا کے لئے سوچو۔ کیا کر رہے ہو۔ ابن الوقت بنو۔ تم وہ بات اختیار کرو۔ جس سے تمہارا کیریکٹر بنے۔ تم میں قومیت پیدا ہو۔ تم سے اخلاق فاضلہ ظاہر ہوں۔ فی الجملہ تم میں قوت عمل پیدا ہو۔ پھر وہ چیز جسکو تم آج گنوا بیٹھے ہو۔ تمہارے سامنے آجائیگی۔ تمہیں کسی ہمسایہ کی امداد کی

ضرورت نہ ہوگی خصوصاً اُن ہمسایوں کی جو سُود میں تمہارا اصل ہی کھا جائیں۔ کچھ پرواہ نہیں کہ جو تم آج چاہتے ہو وہ دس سال یا بیس سال کے بعد حاصل ہو۔ لیکن اُٹھو تو اپنے بَل پر اُٹھو۔ چلو تو اپنے پاؤں پر چلو۔ نامرد نہ بنو۔ مصائب اور شدائد خدا کی طرف سے انسان میں کیریکٹر پیدا کرنے کے لئے آتے ہیں۔ وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون +

اس آیت پر غور کرو۔ مصیبت آنیوالی برکات کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ لیکن انکے لئے جو اس وقت اللہ کے ہو جائیں یعنے اپنے آپ کو ان احکام کے ماتحت لے آئیں۔ جو خدائیتعالیٰ نے ان کے لئے بنائے ہیں۔ اس آیت میں لفظ لبشرا اور لفظ انا للہ وانا الیہ راجعون پر غور کرو۔ کیا تم واقعی اس وقت خدا کے لئے ہو گئے ہو۔ یا کسی فہیم ہاتھ میں آکر ان کی اغراض کے آلات حصُول بن رہے ہو۔ بہرحال میں تمہیں یہی وصیّت کرونگا۔ کہ تم للّہیّت کا جامہ پہن لو۔ تم اپنے میں قوت ایصال خیر اور قوت دفع شر یعنی رُوحِ ہجرت پیدا کرو +

مسئلہ تقدیر کے خاتمہ پر جو میں کہہ آیا ہوں اسکی طرف میں مسلمان نوخیز قوم کی توجہ چاہتا ہوں۔ حصُول کمالات

ہیں انسانی قوٰی کے سوا اگر انسان کو کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی۔ اگر خدا کے نزدیک کوشش کے سوا بعض دیگر اسباب کا مہیا کرنا بھی انسان کو ہوتا تو ربوبیت خداوندی ہر بچہ کو دنیا میں ان اسباب کے ساتھ بھیجتی قرآن نے الفاظ ربُّ العالمین کے ساتھ شروع ہو کر اُن ہی الفاظ میں یہ اعلان کر دیا۔ کہ فیوضِ ربوبیت کی تقسیم میں مساوات کا لحاظ کیا گیا ہے کسی کے ساتھ کوئی رعایت یا جانبداری نہیں کی گئی پھر

لیس للانسان الا ما سعیٰ

کہہ کر یہ اعلان کیا۔ کہ جس سرمایہ کے بہم پہنچانے کے ہم مکلف ہیں۔ وہ صرف سعی ہے۔ علاوہ ازیں ہر بچہ کا ان اسباب سے معرّا ہو کر دنیا میں آنا جو بعض گھروں میں ہوتے ہیں۔ اور بعض گھروں میں نہیں ہوتے۔ ایک فہمیدہ انسان کے سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ انسان کی خوشحالی اور مرفہ الحالی کے لئے جو باتیں اسے ورثہ میں ملتی ہیں وہ خدا کے علم میں چنداں ضروری نہیں۔ اگر ہوتیں تو مبداء فیاض سے ملتیں۔ ان کا یکساں طور پر ہر ایک انسان کو نہ ملنا ہی ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ عوارض و ملحقات ہیں۔ ضروریات میں سے نہیں۔ جس کی ضرورت ہے وہ قوی انسانی ہیں سب کو دیئے گئے۔ تم میں سے ہر ایک میں

بو علی سینا ۔ طارقؓ ۔ اور محمدؐ فاتح بننے کے قوے موجود ہیں ۔ تم اپنے آپ کو محنت کے عادی بناؤ ۔ تم اپنا نصب العین بلند رکھو ۔ اس نصب العین کے مناسب حال اپنے قوے کی تربیت کر کے خالی ہاتھ میدان عمل میں نکل جاؤ ۔ اور کوشش کا کوئی پہلو نہ چھوڑو ۔ اور ایسا کرنے میں قرآن کی بتلائی ہوئی راہوں کو سامنے رکھو ۔ جن کا ذکر کسی قدر میں آگے کرونگا ۔ ناکامیوں کو مہمیز راہوارِ ترقی سمجھو ۔ ہر نقصان کو اس آگ کی طرح سمجھو جس میں میل کاٹنے کے لئے سونا ڈالا جاتا ہے ۔ عربی میں لفظ بلا کے معنے جہاں تکلیف ہے وہاں اسی کے معنے عطا کے بھی ہیں ۔ سونے کو میل کاٹنے کے لئے آگ میں ڈالنے کا نام بھی بلا ہے ۔ سو بلاؤں کو دوسرے لباس میں عطا ہی سمجھو ۔ مخبر صادقؐ نے یوم الابتلا کو یوم الاصطفا کہا ۔ اگر سعی و عمل کچھ چیز نہ ہوتی بلکہ صرف دولت ہی بذاتِ خود کامیابی پیدا کر سکتی ۔ تو نہ تیمور جیسا قلاش گڈریہ سلطنت مغلیہ کا بانی ٹھیرتا ۔ اور نہ محمدؐ شاہ مالکِ خزائن معمورہ اس سلطنت کو کنارۂ زوال پر پہنچا دیتا ۔ ان ممالک میں جاؤ جہاں جمہوریت اپنے کامل رنگ میں ہے ۔ جہاں کے باشندوں کے لئے اس ملک کے فطری خزانے

یکساں طور پر کُھلے ہوتے ہیں۔ اور حاکم و محکوم قوم کے افراد میں رنگ و قوم مغائرت پیدا نہیں کرتی۔ وہاں ہر دوسرا لاکھ پتی یا کروڑپتی تمہیں وہ انسان نظر آئیگا جو دُنیا میں صرف قوّت عمل کے سرمایہ کے ساتھ نکلا تھا بلکہ ان ممالک میں اکثر وہی لوگ تباہ حالتوں میں نظر آئینگے جو زر و جواہر میں پیدا ہُوئے تھے۔ بے محنت کی دولت نے انہیں اپاہج اور عیّاش بنایا۔ اور ایک دو نسل میں تباہ ہو گئے۔ تم ایسے ممالک کے وزراء کو دیکھ لو۔ یہ عموماً معمولی پیشہ ور مثلاً قصاب۔ موچی ماہی گیر کی اولاد واقع ہُوئے ہیں۔ یہ قوت عمل کی برکتیں ہیں جو جمہوری سلطنتوں میں اپنا کامل جلوہ دکھلاتی ہیں۔ اور یہ وہ بات ہے جس کی عزّت اسلام نے کی +

اسلام نے تو مورُوثہ سرمایہ کو قوائے عملی کے مقابل ایسا حقیر سمجھا ہے کہ وہ ایک شخص کے مرنے پر اس کے متروکہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اسلامی قانون ورثہ پر ایک نادان اعتراض کرتا ہے۔ کہ جہاں کسی کے دس بچے اس کے سایۂ عاطفت میں اچھی طرح گذر کرتے تھے جب کُل جائداد ایک ہاتھ میں تھی۔ اس کے مرنے پر

وہ جائداد ٹکڑے ٹکڑے ہوکر کسی وارث کے لئے مُوجب آسائش نہیں رہتی۔ میرا بھی اس منطق پر صاد ہے۔ اگر قوت عمل کو مفقود سمجھا جائے۔ لیکن اگر قوت عمل ہی ایک چیز ہے۔ جو معدُوم کو موجود کر دیتی ہے۔ تو یہ ترکے اور ورثے نئے حقیقت ہیں۔ بلکہ ہارج ترقی ہیں۔ وہ اکثر بچّوں کو اپاہج بنا دیتے ہیں +

رنگون میں آکر جو حیرت میرے سینہ میں ہلکی ہلکی موجزن ہونے لگی۔ وہ پینانگ۔ سنگاپُور۔ اور سرابایا میں پہنچکر تکمیل کو پہنچ گئی۔ یہ ممالک سلطنت چین سے تعلق نہیں رکھتے۔ نہ یہاں رعایا کے لئے وہ ساری کی ساری آسانیاں ہیں۔ جو جمہُوری سلطنتوں میں ہُوا کرتی ہیں پھر بھی میری نگاہ جدھر پڑی وہاں لکھ پتی اور کروڑ پتی چینی ہی نظر آئے۔ اُن میں سے پانچ فیصدی اپنے گھر سے سرمایہ نہ لائے تھے۔ ملک جاوہ کے مفصلات میں پھرنے نے مجھے ہر کروڑ پتی چینی کی ابتدائی حالت دکھلا دی۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی دیہی ضروریات کے پُورا کرنے کی دکان کا مالک ایک چینی ہی نظر آیا۔ اسے ہی میں نے ہر جگہ کُنجڑا۔ بقّال۔ پنساری۔ بساطی۔ چمار درزی۔ حمال۔ رکھشا کھینچنے والا پایا۔ میدان عمل کی ہر شاخ

ہیں چینی ہی چینی نظر آیا ہے ۔ ایک معمولی سا پاجامہ اسکے جسم کے نیچے کے حصّہ کو ڈھکے ہوتا ہے ۔ سر پاؤں اور باقی حصہ جسم کو ملبوس کرنے کی ضرورت سے یہ مستغنی ہے ۔ سو فیصدی یہ منافع لیتا ہے ۔ اسے آئے ابھی دس سال نہیں ہوتے ۔ کہ یہ لاکھ پتی بننے کے خواب کی تعبیر کرنے لگ جاتا ہے ۔ چین سے ان ممالک میں یہ نو وارد وہی سازوسامان لاتا ہے ۔ جو رحم مادر سے اپنے ملک میں لایا تھا ۔ وائے بر حال اسلام ۔ چلو ہم ہندی مسلمان ایک قوم محکوم کے افراد سہی ۔ ان ہمارے بھائیوں کو کیا ہوا ؟ جو چین میں آباد ہیں ۔ وہ تو کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں ۔ پھر وہ کیوں رہین خانہ ہو گئے ۔ مشرقی چھوڑ مغربی دنیا کے کسی حصّہ میں چلے جاؤ تمہیں ہر جگہ چینی ہی نظر آئیں گے ۔ وہ ہر جگہ محنت کے لئے ممتاز ہے لیکن ان سب میں مسلمان چینی نظر نہیں آتا ۔ میں نے ہر ایک ایسے موقعہ پر اپنے مکرم ہمسفر شیخ محمد ضمیر الدین صاحب فاروقی پر اپنی حیرت کو ظاہر کیا ۔ جو میرے مکرم میزبان سیٹھ یوسف حاجی احمد صاحب کی طرف سے میرے ہمراہ رہتے تھے ۔ بجز اس کے ہم اس نتیجہ پر آجائیں ۔ کہ مسلمانوں میں سے قوت عمل ہر ایک جگہ مر چکی ہے ۔ ہمارے سامنے اور کوئی اس معمّہ کا حل نہ تھا ۔ ان واقعات

نے تو یہ امر بھی غلط کر دکھایا - کہ اپنی سلطنت کا ہونا یا سلطنت کی خاص نوعیت کا ہونا کچھ فائدہ اُن لوگوں کو دیگا جو اپنے قوے سے کام نہیں لیتے - یہ سب باتیں قوت عمل کے مقابل لاشئے چیزیں ہیں - ان باتوں کا حسب منشا ہونا ایسا ہی کسی کا اچھے حالات میں پیدا ہونا ممد قوت عمل تو ہے - لیکن ان کا نہ ہونا چنداں ہرج بھی نہیں - صحیح اصولوں پر قوّت عمل کو کام میں لانیوالا ہر جگہ ان ترقیوں کو پا سکتا ہے - جن کی کوئی حدّ و انتہا نہیں الذین آمنوا و عملوا الصّٰلحٰت فلھم اجر غیر ممنون - جو صحیح اصولوں کو قبول کرلے - اور ان پر عمل کرے - ان کے اجر اور ان کی ترقی لامحدود ہوتی ہے - مومن کی ہر جگہ فتح ہے - اور عمل اور صرف عمل اس کا لازمی توشہ ہے کوئی دولت یا ترکہ نہیں ؞

کیا جن حالوں ہم پہنچ گئے ہیں - ان سے نجات پانا کوئی مشکل ہے - اگر مال و دولت یا سرمایہ ہمارے پاس نہیں تو ان چینیوں کو چھوڑ دو خود ہندوستانی جہاں گئے صاحب حیثیت بنے - ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا - ہاں دولت عمل کے مالک تھے - پھر ہمارا کیا گیا ہے - اگر ہم عمل کی حقیقت کو سمجھ لیں - خود ہندوستان میں ہمارے لئے سب کچھ ہے -

خالی شور ڈالنے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ہندوستان میں مجھے مسلمان ہی نقصان کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ شور ڈالنے میں اُن کا۔ اور عمل کے میدان میں دوسروں کا قدم آگے ہے۔ ان کی زبان دوسروں کے ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ موجودہ شور و شر کے ماتحت جب کبھی سڈیشن کے مقدمے ہوتے ہیں تو شاہی مہمان ہونے کی عزت مسلمانوں کو ہی ملتی ہے۔ لیکن اسی شور و شر کے طفیل جب گورنمنٹ کی طرف سے کوئی رعائتیں ملتی ہیں تو وہ برادران وطن کے حصہ میں آتی ہیں۔ اور یہ صحیح طور پر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان ہی میں قوت عمل ہے جس سے وہ ان اعزازوں کے مستحق ہو جاتے ہیں ۔

جس بات کی مسلمانوں میں سخت احتیاج ہے۔ وہ درس قرآن ہے۔ مسلمان قرآن پڑھیں۔ نہ صرف اسلئے کہ وہ اُن کی مذہبی کتاب ہے۔ بلکہ اسلئے کہ وہ اس مصیبت مایوسی کے وقت وہ انہیں کامیابی کا ہر ایک راستہ دکھلائے۔ کتاب حمید ان میں ایسے جذبات پیدا کریگی کہ جن سے ان میں خودداری خوداعتمادی کے ساتھ ساتھ وہ تمام اخلاق فاضلہ پیدا ہونگے۔ کہ جن کے ہوتے پھر ہی زندہ قومیں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ جن سے کسی کو فنداً

شوکت - ثروت اور شرافت حاصل ہو جاتی ہے - جنکے ہونے پر ہی ایک بے زر اور مفلس انسان دُنیا کو ہلا سکتا ہے - اہل دُنیا کو اپنے زیر اثر لا سکتا ہے! اور انھیں اپنی منشاء کے مطابق چلا سکتا ہے -

قرآن پڑھو

قرآن کریم نے ہر ایک امر میں صاحب کمال بننے کا طریق سکھلایا ہے - جو شخص چاہے - کہ اس خسران سے خود بھی بچے اور اپنی قوم کو بھی بچائے جو زمانہ کی ہر ایک چیز کے لاحق ہے - وہ سورۃ العصر کے مطالب کو دائرہ عمل میں لائے - جو شخص اپنے لئے خیر و برکت میں کثرت و بہتات اور اپنے بدخواہوں کے لئے ناکامی دیکھنا چاہے وہ سُورۂ کوثر کو زیر نظر رکھے - مال و اولاد کی کثرت کیلئے سُورہ ھود - بغرض عمل زیر نظر رکھے - الغرض دنیوی فلاح کا کونسا طریق ہے جو قرآن نے نہیں بتلایا - مگر اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے - کہ ہم قرآن پڑھتے ہی نہیں - ہمارے واعظ ہمارے معاملات دنیوی میں قرآن کے احکام ہمیں بتلاتے ہی نہیں - میں یہاں مثال کے طور پر وہ

جامع مانع طریق لکھتا ہوں جو کسی فن یا کسی روزگار میں دوسروں سے سبقت لے جانے کے لئے ہی نہیں۔ بلکہ اُس فن میں یکہ و ماہر بننے کیلئے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اور ماہر بھی وہ ماہر جو اس فن صاحب تدبر سمجھا جائے۔ اور لوگ بطور سند اس کی طرف دیکھیں۔ والنزعت غرقًا ۵ والنشطت نشطًا ۵ والسبحت سبحًا ۵ فالسابقت سبقًا ۵ فالمدبرات امرا ۵ تم اگر کسی فن میں سبقت لیجانا چاہو۔ اور سبقت بھی وہ سبقت کہ تمہاری شان اس معاملہ میں ایک مدبر فے الامر کی ہو جائے تو (والنزعت غرقًا) سب سے اوّل تم ہر ایک دوسرے کام کو قطعاً چھوڑ دو۔ اور اس ایک کام میں ایسا انہماک پیدا کرو کہ گویا تم اس میں تو غرق ہو گئے۔ اور تم میں اور باقی کاموں میں نزاع کھلی ہو گئی۔ اس یکسوئی سے تمہاری طبیعت ضرور اُکتائیگی۔ لیکن تم اسمیں لگے رہو۔ آہستہ آہستہ تم اسمیں دلچسپی لینے لگ جاؤ گے۔ اور تمہیں اسمیں اتنا مزہ آئیگا۔ کہ وہ کام تمہارے نشاط قلب کا موجب ہو گا (والنشطت نشطا) پھر بھی اس کام میں لگے رہو اور کچھ ایسی مہارت پیدا کرلو کہ تم (والسبحت سبحًا) اس فن کے پیراک ہو جاؤ۔ جب اس مقام پر پہنچو گے تو پھر تم اوروں سے سبقت لیجاؤ گے (فالسبقت سبقًا)

اور سبقت کیا معنی (فالمُدبّرات امراً) تم اس فن کے
پیر اُستاد ہو جاؤ گے +

واحسرتا! خدارا غور کرو۔ تم کسی فن میں کسی ماہر
کا نام لو۔ اُس کی زندگی کا مُطالعہ کرو۔ تم ان مراحل بالا
کو ہی اس کے زیر عمل پاؤ گے۔ پھر تم کو تو تمہارا خدا
حکم دیتا ہے۔ ان پر چلنا تو ایک مومن کی شان تھی۔ تم کو
کیا ہو گیا۔ تم انہیں چھوڑ بیٹھے لیکن اس وقت ہندو۔ عیسائی
یہود ی۔ آتش پرست غرض کہ دوسری قومیں ان ہدایات
کو اپنا خضر راہ بنا کر اس ملک میں ہم سے سبقت لیجا رہے
ہیں۔ ہم نے ان ہدایات خداوندی کی پروا نہ کی۔ ہم سب سے
پیچھے رہ گئے +

الغرض کسی فن کا ماہر کوئی اُسی وقت ہو سکتا ہے کہ
جب دوسرے امور سے نزاع کُلّی یعنی انقطاع تام کر کے
دلچسپی اور نشاط قلب کے ساتھ اسمیں لگ جاتا ہے۔ خدارسی کا
بھی یہی طریق ہے۔ اسی کو قرآن نے تبتل کہا ہے۔ سلوک
کی یہ پہلی منزل ہے۔ جو اس منزل اوّل یعنی انقطاع الے اللہ
میں استقامت سے کھڑا ہو گیا۔ اور یہ حالت اس کے
سرور کا موجب ہونے لگی۔ تو وہ خلعت ابدالیت سے
مُزیّن کیا گیا۔ الغرض اگر والنّٰزعٰتِ غرقاً ہ والنّٰشطٰتِ نشطاً

کارنگ ابدالیتؒ کے لئے ضروری ہے۔ تو مچھلی کی طرح بحرِ حقیقت میں غواصی کرنا مقام قطبیتؒ کے مطالبات میں سے ہے انہیں سے دوسروں پر سبقت لے جانے والا چادرِ غوثیتؒ میں لپیٹا جاتا ہے۔ ہاں اس کے بعد پھر کوئی غوث الاقطاب بنے یا سید الاولیا ٹھیرے۔ یہ اسکی اپنی مزید کوشش و عمل سے تعلق رکھتا ہے +

میدانِ عمل میں چلنے والے کے سامنے جو بات ہونی چاہئیے۔ وہ فالسّٰبقت سبقًا ہے۔ یعنی میں اپنے نصب العین میں دوسروں پر سبقت لیجاؤں۔ اسی جذبہ کے پیدا کرنے کے لئے دنیا میں توحید پر ایمان لانا سکھلایا گیا۔ اس سے بڑھ کر مشرک کون ہے جو "ہرچہ انسان کُند کُند اِنسانؔ" پر ایمان نہیں رکھتے۔ توحید کے راگ میں شہنائی نبوّت سے انا لبشر مثلکم کا خوش کن نغمہ اسی لئے ہمارے کانوں تک پہنچا۔ کہ امور اکتسابیہ میں ہم کسی انسان کو اپنے سے بڑا نہ سمجھیں۔ نبوّت تو اکتسابی نہیں۔ بلکہ امر وہبی یعنی عطیہّ ربّی ہے۔ مگر اس کے سوا ہر ایک دوسرے امر کسبیہ میں جس نے یہ سمجھا کہ جو امر زید کر سکتا ہے۔ وہ کوئی اور اِنسان نہیں کر سکتا وہ شرکِ عظیم کا مُرتکب ہو جاتا ہے۔ اِس شرک سے بچنے پر

پر ماہی انسان میں جذبہ سبقت پیدا ہو کر اُسے مدبر فی الامر بنا دیتا ہے +

اِس مقام پر پہنچنے والا اگر اپنے اندر شرح صدر بھی رکھتا ہو تو پھر ایک طرف تو اسکی پیٹھ ہر قسم کے بار ہائے گراں سے آزاد ہو جائیگی - اور دوسری طرف اس کا ذکر بلند ہو جائیگا +

یاد رہے کہ قرآن کریم نے جہاں آنحضرتؐ کے مقامات عالیہ کا مختلف پیرایوں میں ذکر کیا ہے - پھر اگر وہ مقامات مناسب حدود کے اندر دستِ اکتساب کے لئے کھلے ہیں - تو اسی جگہ قرآن ہمیں اُن مقاماتِ پر پہنچنے کا راستہ بھی بتا دیتا ہے - قرآن آنحضرت صلعم کی ذات کے متعلق تو امورِ مستقبل کو بصیغۂ ماضی اسلئے بول دیتا ہے کہ آنحضرت کے متعلق ان کا حصول ایک امر فیصل شدہ ہے - ہاں جو کام کرنے کے لئے آنحضرت صلعم کو حکم دیتا ہے وہ دراصل اس مقام پر پہنچنے کا راستہ ہوتا ہے - جس پر چلکر کوئی دوسرا بھی ایک حد تک پہنچ جاتا ہے - مثلاً انا اعطینٰک الکوثرؕ فصل لربک وانحرہ ان شانئک ھو الابتر - کیا ہمنے تجھے کثرت سے خیر و برکت نہیں دی - تو اب صلوٰۃ اور قربانی کا پابند ہو جا - تیرا دشمن ہی ابتر ہوگا - تیرے نام لیوا

تو ہمیشہ تک دنیا میں رہینگے جو شخص کثرت سے خیر و برکت حاصل کرنا اور اپنے بد خواہوں کو اپنے مقابل نامراد دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس سورۂ شریف میں فصل لربک وانحر کی حقیقت سمجھے۔ اور اس پر عمل کرے جس کی تشریح انشاء اللہ العزیز اپنے مقام پر کی جائیگی یہاں ہمیں یہ دکھلانا تھا کہ جو مقامات عالیہ آنحضرتؐ کو یقیناً ملنے تھے ان کے حصول کا راستہ بھی قرآن وہیں بیان کر دیتا ہے۔ جہاں اس مقام کا ذکر ہوتا ہے۔ اور اگر اس کا دروازہ کسی اور کے لیے بھی کھلا ہو تو اسکا بھی راستہ وہی ہوتا ہے آجکل جہاں صحیح اور سچے لیڈروں کی ضرورت ہے وہاں لیڈری کا گرم بازار بھی سخت گرم ہے۔ خیال شہرت انسان کو اس میدان میں لے آتا ہے۔ اسمیں بھی مضائقہ نہیں بشرطیکہ یہ لوگ صحیح طور پر اپنا اپنا فرض ادا کریں۔ اس قحط الرجال میں یہ سب غنیمت ہے بالمقابل جو سچا لیڈر بننا چاہیے اسے اپنی پیٹھ بھی مضبوط کر لینی چاہیئے۔ اسوقت تو الفضل لیڈری اس قدر بارگراں ہے۔ کہ اس سے مضبوط سے مضبوط پیٹھ ٹوٹ سکتی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے ایسی راہ بتلائی کہ جس سے انسان سبکسار ہی رہے۔ اور مناسب شہرت بھی ہو طبعاً ہر ایک انسان میں دو باتوں کی خواہش

ہوتی ہے۔ پہلے تو وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے بوجھوں سے سبکبار ہو پھر وہ یہ چاہتا ہے۔ کہ لوگ اس کا ذکر خیر کریں۔ اس کا نام روشن ہو۔ اور وہ اس بلندی کو پہنچ جائے۔ جہاں دوست دشمن کی نگاہ پڑے۔ ان دو امور کی طلب ایک فطری طلب ہے کیونکہ اسی سے قوت عمل حرکت میں آتی ہے۔ اسی لئے مبدءٔ فیاض نے اسے ہماری فطرت میں رکھ دیا ہے۔ ہاں انکے لئے حدود مقررہ ہیں۔ جن سے آگے جانا دنیا کیلئے موجب تباہی ہوا ہے۔ اس امر میں حدود سے متجاوز ہونے کا نام خود پسندی۔ خود نمائی۔ دوسروں کی نکتہ چینی۔ عیب جوئی نمامی۔ غیبت مضحکہ۔ ناجائز ہنسی ٹھٹھا کرنا۔ یہ سب باتیں جو ایکدوسرے کے ساتھ تسلسل مربوط ہیں۔ وہ جذبہ رفعت ذکر کے غلط استعمال یا اس سے غلط طریق پر حاصل کرنے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سے علی الخصوص ہمارے لیڈر بچیں۔

یہ ایک لطیف فلسفہ اخلاق ہے۔ جسے قرآن نے ہی کھولا۔ لوگوں نے اخلاق کی تقسیم تو اخلاق ذمیمہ اور اخلاق حسنہ میں کر دی لیکن قرآن نے ہی اس راز کو دنیا پر آشکارا کیا۔ کہ ہر نیکی اور بدی کی بنیاد فطری جذبات ہے جن کے ایک استعمال کا نام نیکی اور ایک استعمال کا نام بدی ہے۔

مذہب دنیا میں مقررہ حدود دکھلانے آتا ہے۔ کاش خدا کسی کو فرصت اور موقعہ عطا کرے۔ وہ فلسفۂ اخلاق قرآنی کو ذیعلم دنیا کے آگے پیش کرے۔ اور اُسے قرآن کی حکومت تلے لے آئے۔ مغرب کا مسلمان کرنا آج مشکل نہیں۔ اس قسم کا لٹریچر مسلمان پید اکریں۔ آج دنیا حلقہ بگوش اسلام ہو جائیگی۔ جو چیز مسلم تلوار کے زور سے جا چکی ہے۔ اُسے تیغ علوم قرآن آسانی سے واپس لیلیگی۔

انسان کی فطرت میں جیسے کہ بیان ہوُا خدائیتعالیٰ نے جو یہ دو جذبات ڈال دیئے ہیں۔ یعنے بوجھوں سے رستگاری اور رفعت ذکر۔ یہ دونوں جذبات نعمت الٰہی ہیں۔ یہ دونوں باتیں اسی نسبت سے کسی کو حاصل ہو جاتی ہیں جس نسبت سے اسمیں وسعت قلب اور شرح صدر ہوتی ہے۔ لیکن سینہ اُس کا کھلا ہوتا ہے جس کا ہاتھ کھلا ہوتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ سے شرح صدر ہوتی ہے۔ اور اس سے ذکر خیر اور بارہائے گراں سے سبکساری ہو جاتی ہے شرح صدر اور انفاق تو گویا لازم ملزوم ہیں۔ اور سبکساری ان کا لازمی نتیجہ ہے " جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے۔ کہ جس کے آگے ہر ایک سر جھکاتا ہے۔ تمہاری داد و دہش۔ تمہاری جود و سخا تمہارا دوسروں

کے فائدہ کیلئے ایثار تمہارا اپنا حرج کر کے دوسروں کے کام آجانا یقیناً تمہارے ذکر خیر کا موجب ہوگا۔ اور یہ وہ شانِ انفاق و عمل ہے۔ جس کی طرف و مما رزقنٰھم ینفقون اشارہ کر رہا ہے لیکن اس حکم پر تمہارا عمل اسی نسبت سے ہوتا ہے جسقدر تم میں وسعتِ قلب ہوتی ہے اسی طرح تمہاری پیٹھ سے بھی تمہارے بوجھوں کے ہلکا ہونے کا راستہ بھی یہی ہے۔ وہ بات جو زید کو گھبراہی نہیں دیتی بلکہ اس کو ہلاکت تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ ایک وسیع القلب کی نگاہ میں پر پشہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ یہ حقیقت شاید قارئین کتاب پر اور بھی کھل جائے اگر گرانباری کی بنیاد کو سمجھ لیں۔ یہ دو امور سے پیدا ہوتی ہیں جو چیزیں ہمیں محبوب ہوں ان کا ہونا نہ ہونا یا ان کا ہم سے چھن جانا۔ اگر تم اپنی زندگی کا مطالعہ کرو تو جو چیز تمہاری نگاہ میں آج عزیز و محبوب ہے۔ وہ دوسرے حالات کے پیدا ہونے پر ایسی بے وقعت ہو جاتی ہیں۔ کہ اگر وہ تم سے چھن جائیں یا تمہارے پاس ہی نہ ہوں تو تمہیں ذرا بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ کل کا بارگراں آج خس و خاشاک کی حقیقت نہیں رکھتا۔ لیکن وہ بات جو ایک امیر غریب انسان کی نگاہ میں دنیوی چیزوں کو عزیز اور محبوب

رہتے نہیں دیتی - وہ اسکی بلند نظری یا سینہ کی کشادگی ہے
اسکی مثال تمہارے اپنے بچپن اور اُس کے مابعد بقیہ
زندگی ہے - ایک بچہ سے اگر چھ دام چھن جائے یا اُسے
اس کی ضرورت ہو اور نہ ملے تو اسکی نگاہ میں دُنیا جہان
اندھیر ہو جاتا ہے - عمر کے بڑھ جانے پر نگاہ بلند ہوئی
سینہ کشادہ ہو گیا - اب چھ دام کیا چھ روپے بھی
تکلیف نہیں دیتے - وہ بات جو پہلے اپنے وزن میں پہاڑ کی طرح
نظر آتی تھی - آج وہ ایک ادنے کنکری کے برابر ہو جاتی
ہے - وہی بچہ جو کل چھ دام کی چیز کسی اور بچہ کو نہ دینا چاہتا
تھا اور اس لئے اپنے ہمجنسوں میں بُری طرح یاد کیا جاتا تھا -
آج بڑا ہو کر گو کیسا ہی تنگدست ہو - کسی محتاج کو آسانی
سے چھ روپیہ دے کر اپنے لئے ذکر خیر پیدا کرا لیتا ہے
یہ مثال جو ہم نے بچہ کی دی ہے - یہ ٹھیک ہم پر حاوی
ہوتی ہے - خلاصہ یہ ہے کہ بار گراں سے اِنسان کا آزاد
ہونا - اور اس کے ذکر خیر سے دنیا کا معمور ہونا کشادگی
سینہ کو چاہتا ہے - چنانچہ اس حقیقت کو قرآن نے سورۂ
انشراح کے پہلے تین جملوں میں بیان کیا ہے - الم
نشرح لک صدرک ووضعنا عنک وزرک الذی
انقض ظہرک ورفعنا لک ذکرک - کیا ہم نے تیرا سینہ

کشادہ نہیں کر دیا۔ اور تجھ سے وہ بوجھ نہیں اٹھا لئے جو تیری پیٹھ کو دبا رہے تھے اور تیرا ذکر بلند نہیں کیا۔ ان مختصر فقروں نے مسلمانوں کو سبق دیدیا ہے کہ رفعت ذکر اور سبکدوشی بار گراں کی کنجی شرح صدر ہے۔

یہ شرح صدر کیسے پیدا ہو۔ اس کا تفصیلی جواب تو تم قرآن کی ان آیات میں تلاش کرو۔ جن میں تقویٰ اور بر کے حصول کی راہیں لکھی ہیں۔ اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہم محبوب چیزیں دوسروں کو دیدینے کی عادت ڈالیں۔ اس سے یہ چیزیں ہماری نگاہ میں کم حیثیت ہو کر ہمیں ان اغلال سے آزاد کر دینگی۔ جو ان چیزوں کے چھن جانے یا ہونے سے کوہ کی طرح ہماری کمر کو دہرا کر دیتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا۔ لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون (تم ہرگز نیکی تک پہنچ نہیں سکتے جب تک اپنی محبوب ترین چیزیں تم دوسروں کے فائدہ کیلئے خرچ نہ کرو) کیا مقام حسرت ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے ہی سوسائٹی وہ مضبوط سوسائٹی بنا کرتی ہے۔ کہ اس کے ممبر دنیا کو ہلانا جانتے ہیں۔ ان سے ہی انسان میں سیرت اور کیریکٹر پیدا ہوتا ہے۔ جو ہم میں نہیں۔ آج ہم عدم تعاون کو لئے پھرتے ہیں

اور ہجرت پر زور دیتے ہیں۔ اور مزہ یہ ہے۔ کہ ان امور
عالیہ کی حقیقت سے ہم بہت دور ہیں۔ تم پہلے افرادِ قوم
میں وہ باتیں پیدا کرو۔ انہیں اس راہ پر چلاؤ جس سے
اُن میں بلند نظری پیدا ہو۔ وہ ان چیزوں کو وقعت
دینی چھوڑ دیں جو آجکل اُن کی نگاہ میں محبوب ہیں۔
جن امور کے متعلق تم عدم تعاون چاہتے ہو۔ اگر وہ
چیزیں ان کی نگاہ میں عزیز یا کفیل کار ہیں تو تمہاری
سب کوششیں بیکار ہیں۔ تم مسلمانوں کو لن تنالوا البر۔۔
کے حکم کی طرف راغب کرو۔ ان میں انفاق فی سبیل اللہ
کی رُوح پیدا کرو۔ طبعاً اُن کی نگاہ میں آج کی عزیز چیزیں
بے وقعت ہو جائینگی۔ پھر عدم تعاون کیا چیز ہے
خود بخود ان کے اندر رُوحِ ہجرت پیدا ہو کر انہیں مقاصد
کے حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی پر تیار کر دیگا۔ وہ
دن تمہارے لئے روزِ عید ہو گا۔ جب تم میں
رُوحِ ہجرت پیدا ہو گی۔ اگر شور شر کرنا تمہیں
مفید نظر آتا ہے تو بہتر ہے کئے جاؤ۔ لیکن یہ بھی یاد رکھو
شور و شر قوتِ عمل کو بھی کمزور کر دیا کرتا ہے۔ وہ اس
متانت اور سنجیدگی کے خلاف ہے۔ جس کے بغیر حقیقی
کیریکٹر نہیں بنا کرتا۔ میں اس شور و شر کو بنظرِ استخفاف

نہیں دیکھتا لیکن میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رک سکتا کہ جس قدر کوشش اس ایجیٹیشن کے لئے ضروری ہے اُس سے نوگنی زیادہ کوشش افراد میں انفاق فی سبیل اللہ وایثار وغیرہ کی رُوح پیدا کرنے میں خرچ کرو۔ اور یہ افراد زیادہ تر اُٹھتی نسل میں کے ہونے چاہئیں اسلئے تم اسلام پر رحم کروگے۔ اگر طلباء کو اس ایجیٹیشن سے الگ رکھوگے۔ اس کے بجائے اُن کا نصب العین بدلو۔ ان کے روزگار میں وہ نوعیّت پیدا کرو جہاں اُن کا دل ودماغ ان کی قوّت فیصلہ وتدبر فی الجملہ اُن کی قوت عمل خارجی دباؤ سے آزاد رہے۔ وہ ایک طرف مال پیدا کرنا۔ اور دوسری طرف اس مال سے مانوس نہ ہو کر اُسے فی سبیل اللہ یعنی قومی اغراض میں خرچ کرنا سیکھیں۔ اُن کے نزدیک کسی قومی کام کو کر دینا آج کل کے شادی بیاہ رچانے سے زیادہ معزز ہو جائے قرآن نے صدہا راہیں اس سیرت کے پیدا کرنے کی بتلائی ہیں۔ خدارا ہمارے متکلمین قرآن سے وہ باتیں اخذ کرکے انہیں اُس حکیمانہ اور دلاویز پیرایہ میں پیش کریں۔ کہ وہ آسانی سے ان مغربی مزاج نوجوانوں کے حلق سے اُتر جائیں۔ میرے نزدیک یہ جہاد اکبر ہے فلسفہ

قرآنیہ پر مختلف رنگوں میں کتابیں لکھو۔ اگر وہ نصاب تعلیم نہیں ہو سکتے تو تم یہ کتابیں اپنے طلباء تک پہنچا دو وہ خالی وقت میں پڑھ سکتے ہیں +

رفعتِ ذکر اور سبکدوشی کو جیسے کہ اوپر ذکر آچکا ہے قرآن نے شرحِ صدر کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ اس شرحِ صدر کے حصول کی راہ کی تفصیلات سے تو قرآن بھرا پڑا ہے لیکن ان کا لُبِ لباب سُورۃ زیرِ بحث کے آیات ذیل میں آجاتا ہے +

فان مع العسر یسرًا ان مع العسر یسرا فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب " یقیناً تکلیف کے ساتھ آسانی ہے۔ اور آسانی کے ساتھ تکلیف ہے۔ پھر جب اس سے آزاد ہو جائے تو بہت کوشش کر۔ اور اپنے ربّ کی طرف رجوع کر" بظاہر یہ تین جملے ہیں۔ جو نہ صرف ان مراحلِ ثلاثہ کا ذکر کرتے ہیں جن میں سے گذرنے کے بغیر کوئی شخص کامل شرحِ صدر حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان جملوں میں ان عقاید کا بھی ذکر کردیا ہے۔ جن سے کما حقہٗ آشنائی نہ ہونے نے مشرق اور مغرب کے تمدن پر گہرا اثر کر کے اخلاق و آداب میں اور ایسا ہی دیگر معاملات میں انہیں دو متضاد مقامات پر کھڑا کر دیا +

کہنے کو تو ہر ایک شخص رنج و راحت کو توام قرار دیتا ہے لیکن ان لوگوں کی تعداد دنیا میں بہت ہی کم ہوتی ہے۔ جو اس اصول کے عملاً پابند ہیں "عسر" اور "یسر" زمانہ میں رات دن کی طرح ہیں کوئی انسان ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی زندگی میں یہ دونوں رنگ نہ دیکھے ہوں۔ جب یہ دونوں حالتیں ناگزیر ہیں۔ اور ان سے مضر ہی نہیں۔ تو پھر ایک کا حاصل کرنا اور دوسرے سے بچنے کی کوشش میں لگنا جہاں طبعی تقاضہ ہے۔ وہاں سچا نشاط قلب اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان دونوں سے لاپرواہ ہو۔ تکلیفیں اُسی کو تکلیف دیتی ہیں جو تکلیف سے ڈرتے ہیں۔ آسانی اپنے موجود ہونے پر انہیں کے وبال جاں ہو جاتی ہے جو خوگر آسانی ہوں۔ انسانی دوڑ دھوپ میں وہی کامیابی تام کا منہ دیکھ سکتا ہے۔ جس کی نگاہ میں تکلیف اور آسانی کی بڑی وقعت نہ ہو۔ جو ہر وقت ان دونوں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو۔ نہ خوگر آسانی اس قدر ہو کہ اس کا نہ ہونا موجب تکلیف ہو۔ نہ تکلیف سے اتنا ناآشنا ہو کہ اس کا آنا اسکی مصیبت کا موجب ہو۔ بالفاظ دیگر وہ فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا کی حقیقت سے عملاً آشنا ہو۔ وہ ایثار و رضا جس کا میں نے ابھی اوپر

ذکر کیا ہے یعنی مکشوبہ عزیز چیزوں سے جُدا ہوجانا یا ایسی
چیز کے نہ ہونے پر چنداں مضطرب نہ ہونا۔ اگر حسب
تصریح بالا شرح صدر کے لئے ضروری ہے۔ تو پھر یہ کیفیت
قلب اُسے ہی نصیب ہوتی ہے۔ جو بمجوائے آیت بالا تاثرات
"عُسُر و یُسر" سے بالاتر ہو۔ جو نہ راحت کا غلام ہو نہ کلفت سے
چنداں ہراساں۔ یہ دونوں حالتیں اُسکی نگاہ میں یکساں
ہوں۔ وہ کسی حال میں ہو۔ اطمینان قلب کو اپنے ہاتھ
سے نہیں دیتا۔ نہ اسباب راحت کے پیدا ہونے پر کوئی
دوسرا اس کے چہرے پر غیر معمولی بشاشت دیکھتا ہے نہ
تکلیف اُسے پژمردہ کرتی ہے۔ وہ ہر حال میں رضا بالقضا
کا مجسمہ ہوتا ہے۔ یہ مقام مشکل تو ہے۔ لیکن نازک سے
نازک اور مشکل سے مشکل مہمات کا کفیل بھی یہی مقام ہے
موجودہ مشکلات سے مسلمان اگر نکلنا چاہیں تو پہلے اس مقام
پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ جس نسبت سے کوئی اس مقام
رضا و تسلیم کی سیر کریگا۔ اسی نسبت سے کامیابی کے ہم عنان
ہوگا۔ یہ مقام اُسے نصیب ہوتا ہے۔ جو رنج و راحت
کی اودھیڑ بُن سے فارغ ہو جاتا ہے۔

اس مقام تک پہنچنا جہاں شان اولوا العزمی کا زیور
ہے وہاں یہ مقام خطرات سے بھی خالی نہیں۔ رنج و راحت کی

حکومت سے نکلنے کی کوشش انسان کے قوت عمل کو کمزور بھی کردیتی ہے مثلاً اگر تکلیف و راحت سے میں آزاد ہوجاؤں تو ممکن ہے کہ کام کرنا ہی چھوڑ دوں۔ کیونکہ ہمارے کل عمل وحرکت تو تکلیف سے طے اور راحت کو حاصل کرنے کیلئے ہوتی ہے۔ اسلئے بعض وقت اس قسم کا استغناء رنج و راحت سے لاپرواہ کرکے آہستہ آہستہ جدوجہد کو کمزور کردیتا ہے میدان عمل میں صرف اتنا ہی قدم اُٹھتا ہے۔ جو فقنی تکلیف سے بچا سکے۔ یا بالفرض قوت لایموت کیلئے کافی ہو۔ آہستہ آہستہ اُسے تمدن و آسائش کی ہر شکل سے نفرت ہونے لگتی ہے وہ اسکی نگاہ میں دھوکہ یا باصطلاح ہنود مایا بن جاتی ہے۔ آگے تو وہ ان سے لاپرواہ تھا۔ اب وہ ان سے بچنے لگتا ہے بلکہ ان سے اُسے وحشت و نفرت ہوتی ہے وہ اسباب تمدن کے پیدا کرنے میں نہ صرف امداد کا ہاتھ ہی نہیں بڑھاتا۔ بلکہ اسکی معدومیت کی فکر میں لگجاتا ہے۔ ہندو فلسفہ مایا نے جسقدر قوائے انسانی کو بیکار کیا جسقدر اچھے دل و دماغ کے لوگ اسی خیال میں دُنیا کو تیاگ کرکے انسانی قوائے عالیہ کو حالت جمود میں لے آتے ہیں وہ ظاہر ہے۔ میرے نزدیک ہندوستان کا ہمیشہ دشمنوں کے زیر حملہ رہنا بہت حد تک اسی قسم کے

خیالات کا نتیجہ ہے۔ جب دُنیا سلطنت مال و دولت گھر بیوی بچے سب مایا ہی مایا ہے۔ اور ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے تو پھر اگر کوئی گرفتار مایہ ان کو مجھ سے لیلے تو لیلے مجھے کیا رنج ہے ÷

کس قدر نازک مقام ہے کہ رنج و راحت سے استغنا کی رُوح جو ایک سالک ایک قومی ریفارمر یا نازک سے نازک اور مشکل سے مشکل مہمات کو طے کرنیوالے کیلئے ازبس ضروری ہے۔ اس کے پیدا کرنے کے جو مراحل ضروریہ ہیں وہی مقصد اصلی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہ رُوح استغناء جس مقام عالی پر پہنچنے کیلئے ضروری تھی۔ وہ مقام اب خود ہماری نگاہ میں مایہ اور شعبدہ زمانہ ہو جاتا ہے۔ غرض تو یہ تھی کہ راحت و آرام کا جادو ہمیں اپنا فریفتہ کر کے ہماری رفتار عمل کو اپنے دائرہ میں روک لے۔ نہ رنج و مصیبت کا حملہ ہمیں سراسیمہ کر کے ہمارے قدم عمل کو بیکار کر دے۔ ان دونوں حالتوں سے بچنے کیلئے مستغنی ہونے کا سبق دیا گیا تھا لیکن ہم کچھ ایسے مستغنی ہو جاتے ہیں۔ کہ رفتار عمل سے ہی متنفر ہو کر اپنے کل قویٰ کو حالت جمود میں لے آتے ہیں۔ ہندوستان میں آ کر بد نصیبی سے ہم مسلمان بھی غلط تصوف کے ماتحت اس طرف جا رہے ہیں۔ ہم بھی آج اسباب

راحت کو رُوحانی ترقیات کے منافی سمجھ کر راہین غفلت و بیکاری ہو چکے ہیں۔یہی حالت کم و بیش مشرقی ممالک کی ہے۔ بودھ مذہب نے دوسرے الفاظ میں اسی حقیقت پر اپنے پیروؤں کو قائم کر دیا۔جس قوم کا مطمح نظر۔نروان یعنے کامل فنا یا فنا سے تام ہو۔یعنے وہ مقام جہاں رنج و راحت چھوڑ ان کے جذبات تک مرجائیں وہ قوم یا مذہب کو چھوڑ دے۔یا تمدّن و سلطنت سے محروم ہو جائے۔مسیح کی تعلیم بھی دوسرے رنگ میں اسی طرف جا رہی ہے۔اور جب تک یورپ اس کے زیر اثر رہا تہذیب و تمدن سے دور رہا۔دراصل مسئلہ زیر بحث نہایت ہی مشکل ہے اور اکثروں نے اس میں ٹھوکر کھائی ہے۔اس گتھی کو بھی اگر سلجھایا تو اسلام نے سلجھایا۔

مشرق کے بالمقابل عین اس کے برخلاف حالاتِ مغرب ہیں جس نے کسی امر پیش نظر میں جد و جہد کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔وہ آسائش و راحت کے اسقدر غلام ہیں کہ اس کے حصول میں انکی ہر ایک قوت اس وقت لگی ہوئی ہے۔ان کے اس انہماک دنیا سے جو اُن کے تمدن و اخلاق پر اثر پڑا اور جس طرح اس سے دوسروں کا اتلاف حقوق ہوا۔وہ کوئی امر مخفی نہیں ✝

مشرق مغرب کے یہ دو حالات ضدین نسل انسانی کیلئے مفید نہیں۔ ایک قوائے انسانی کو بیکار کرتی ہے دوسری تعیشات کا گرویدہ انسان کو بنا کر اسے اپنے بوجھ کو دوسروں پر ڈال لینے کا عادی کر دیتی ہے۔ اور انہیں اتلاف حقوق غیر پر آمادہ کرتی ہے۔ اس افراط تفریط سے نکلنے کی ایک ہی راہ ہے۔ ہم میدان عمل میں اسلئے کوشاں ہوں کہ ہمارے کُل عمل و حرکات کے ثمرات صرف ہمارے لئے راحت پیدا کریں۔ اور ہمیں تکلیف سے بچائیں۔ بلکہ ہم ان ثمرات سے حسب ضرورت حصہ لیکر باقی کو خلق اللہ کے فائدہ میں خرچ کر دیں۔ ہم دوسروں کی نفع رسانی میں اپنی خوشی دیکھیں۔ صرف یہی ایک طریق ہے کہ جسکے ماتحت ہم ذاتی رنج و راحت سے تو مستغنی ہو جاتے ہیں لیکن پرستاران مایا و تصوف باطلہ کی طرح اپنے قویٰ کو بھی بیکار نہیں کر دیتے۔ اسی طرح اگر مغربی اقوام کی طرح ہم رات دن جدوجہد میں لگے رہتے ہیں تو چونکہ ہماری جدوجہد کا مقصد خلق کا بھلا ہے۔ اسلئے ہم دوسروں کی اتلاف حقوق سے بھی بچ جاتے ہیں۔ اس طرح نہ ہم میں اپاہج ہو جانے اور غفلت کی روح پیدا ہوتی ہے نہ ہم یورپ کیطرح دوسروں کے حقوق سے لاپرواہ ہوکر نفسانیت کے غلام بنتے ہیں۔ الغرض وہ مقام جس کا نام وسعت قلب

اور شرح صدر ہے۔ وہ تین باتوں کے پیدا ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ اولاً انسان میں رنج و راحت سے استغنا کی روح پیدا ہو۔ تکلیف و آسانی اس کی نگاہ میں ایک ہو جائے اس کیفیتِ قلبی کے بڑے پہلو یعنے سند جب عمل سے بچنے کیلئے۔ اور ایسا ہی رہیں تاثراتِ رنج و راحت ہونے سے جو استغراق فے الدنیا پیدا ہوتا ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کیلئے وہ اپنے مکسوبات کو دوسروں کیلئے وقف کرنا سیکھے۔ یعنے اسمیں تین باتیں پیدا ہوں۔ رنج و راحت سے استغنا (۲) جد و جہد عمل (۳) انفاق فی سبیل اللہ + ان باتوں کے ہونے پر انسان میں وہ شرح صدر پیدا ہوگی۔ جس کی پیٹھ سے بوجھ اُتر جائیں گے۔ اور اس کا نام دنیا میں بلند ہوگا چنانچہ اِن ہی تین باتوں کا ذکر سورہ زیر بحث کے بقیہ حصہ میں آیا ہے۔ فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا۔ فاذا فرغت فانصب والی ربك فارغب۔ رفعت ذکر جس شرح صدر کو چاہتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے پہلا مقام یہ ہے کہ تمہاری نگاہ میں تکلیف و آسانی یکساں ہو جائے۔ پھر جب تم اس مرحلہ سے فارغ ہو جاؤ (فانصب) تو سخت جد و جہد کرو (اور اس جد و جہد کا نتیجہ) منشاءِ ربی کو پورا کرنا ہے جو رب العالمین ہے۔ اور اسکی منشاء یہ ہے کہ

اس کے پرستاروں کی جدوجہد کے نتائج مخلوق کی پرورش میں لگجائیں +

میں نے یہ چند باتیں قرآن کی فضیلت قائم کرنے کیلئے نہیں لکھیں۔ میرے مخاطب مسلمان ہیں جنہیں آج یہ باتیں مفقود ہیں۔ وہ جس کتاب ہدایت کو پس پشت کر بیٹھے ہیں اُسے کھولیں اور پڑھیں۔ اور اس پر عمل کریں۔

میں اپنے لیڈروں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ کہ وہ اوروں کی طرح لیڈری کا سرٹیفکیٹ کسی پولیٹیکل مقدمہ میں پھنسکر جیل میں جانا ہی نہ سمجھیں۔ آجکل بعض ہندو مسلمان لیڈر تو خود گورنمنٹ بناتی ہے کسی کو جیل میں بھیج کر اس کے چہرے کے اردگرد وہ ہالۂ عزّت دیدیتی ہے جو مظلومیّت اور شہادت کے ساتھ سایہ کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ سچے لیڈر بھی ان ہی راہوں سے گذرتے ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ ہماری قوم میں ایسے بہت کم ہیں جن کا مایۂ ناز صرف جیل ہو۔ مزید برآں میں نے تعریضاً نہیں بلکہ اس غرض سے یہ لکھا ہے کہ جو اس طرح بھی اس قابل ہوگئے ہیں۔ کہ لوگ ان کی طرف بطورِ لیڈر دیکھیں وہ حقیقی زیورات لیڈری سے اپنے آپ کو آراستہ کریں۔ اس کے تعلق میں مجھے اپنے بعض ہم مذہبوں کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہے کہ وہ

اس مذموم طریق حصول لیڈری کی طرف کبھی رخ نہ کریں۔ جس کی آسانگی ہر ایک کو اس کے اختیار کرنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس بات کو پبلک پسند کرے اس کے حامی بن جانا۔ اسی طرح ایسی بات کو سوچتے رہنا کہ جس سے پبلک خوش ہوگی خواہ وہ مفاد قومی کیلئے مہلک ہی کیوں نہ ہو۔ اور اُسے اختیار کرنا یہ نہایت ہی قبیح اور مکروہ باتیں ہیں۔ جس سے ہمارے لیڈروں کو پرہیز کرنا چاہئے۔ یا پبلک کے گندے مذاق کی اصلاح کی بجائے اسکی اسلئے آبیاری کرنا۔ کہ پبلک ہم سے خوش ہو کر ہمارے پیچھے لگجائے۔ مجھے اس مقام پر صرف یہی کہنا ہے کہ ہماری حالت اب بہت نازک ہے۔ ہم ان کھیلوں کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ یہ ایثار کا وقت ہے۔ اور ایسے لوگوں کا اگر کوئی ہم میں ہے۔ یہی بڑا بھاری ایثار ہوگا۔ کہ وہ ان مذموم راہوں پر نہ چلے۔ تم اس سورۂ شریف کے مطالب کو سامنے رکھو۔ تم دنیا سے مستغنی ہو تم رنج و راحت کی ترغیب و تحریص سے بہت پرے نکلجاؤ۔ تم میدان عمل کے ہیرو بن جاؤ۔ تم اپنے مکسوبات کو وقف قوم کرنے کی عادت ڈالو۔ اس سے تم میں ایک رُوح پیدا ہوجائیگی۔ جس سے تم مکروہات دنیا کا آسانی سے مقابلہ

کرلو گے۔ اس سے تم میں وہ رُوح ہجرت پیدا ہو جائیگی کہ جس کے موجود ہونے پر کوئی دُنیوی طاقت تمہیں کسی مقصد کے حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی بشرطیکہ وہ مقصد خلق اللہ کے فائدہ کیلئے ہو۔ اسمیں بیوجہ کسی غیر قوم کی مخالفت نہ ہو۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے۔ کہ وہ تعلیم قرآنی کی منشاء کے موافق ہو +

اس وقت ہمیں چاروں طرف تکلیف نظر آتی ہے ہمارے قدم خسران تک پہنچ چکے ہیں۔ جس کے احساس نے ہمیں گھبرا کر ہمیں ہاتھ پاؤں مارنے کی طرف تو آمادہ کیا۔ اور عجب نہیں کہ حالت اضطرار ہم سے کچھ کا کچھ کرا لے اسلئے بہترین طریق یہ ہے کہ ہم ہر قدم پر قرآن کریم سے مشورہ لیں۔ دنیا میں مذہبی لٹریچر کی یہی ایک کتاب ہے۔ جو ہر ضرورت انسانی پر ہدایت کی کفالت کر سکتی ہے۔ پھر جب اس کے متعلق ہمارا ایمان کامل ہے۔ تو کیوں ہمارے لیڈروں کے سامنے آٹھوں پہر قرآنی ہدایات نہ رہیں ہم موجودہ خسران سے کیوں گھبرائیں۔ زمانہ میں کوئی چیز نہیں جس کا قدم گھاٹے کی طرف نہ ہو۔ تاریخ عالم اس پر شاہد ہے۔ کہ کسی چیز کا قیام۔ اسکی کامیابی اور ایسے ہی اس کے نقصان سے محفوظ رہنا صرف ایک ہی

امر سے وابستہ ہے۔ اس چیز کے متعلق چند صحیح اصول ہوتے
ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونے سے یہ باتیں حاصل ہو جاتی ہیں
چنانچہ جس پر ان اصولوں کا راز کھل گیا۔ ان پر اُس کا
عمل اُسے نقصان و خسران سے بچا دیتا ہے۔ ہمارا
یہ مذہبی فرض ہے کہ ہم ہر فن اور ہر پیشہ و ہر تجارت۔ الغرض
ہر ایک شغل معیشت کے متعلق اصول حقہ دریافت
کریں۔ اس پر خود چلیں اور اوروں کو چلائیں۔ قوم بنانے
کا ایک یہ راز ہے۔ کہ کسی امر میں کامیابی کا کوئی راز
ہم پر کھل جائے تو اس کے متعلق بخل نہ کریں۔ ان
باتوں کی تعلیم صبر و استقامت سے دوسروں کو دیں خسران
کی ایک بڑی بھاری راہ یہ ہوتی ہے۔ کہ جب کوئی
نیک دل انسان کسی دوسرے کو کامیابی کا کوئی اصول
حقہ بتلائے تو دوسرے کان ہی نہیں دھرتے۔ بلکہ
اسکی نیت پر حملہ کرتے ہیں۔ لیکن ہم پر یہ وقت آگیا ہے
کہ ہم ان نادانوں کے مقابل صبر کریں۔ کوئی ہماری
سنے یا نہ سنے لیکن جو امر نیک یا کسی کام میں کامیابی
کی کوئی حقیقی راہ ہم پر کھل گئی تو مما رزقنٰھم
ینفقون پر عمل کر کے صبر و تحمل کے ساتھ وہ باتیں دوسروں
کو وصیت کر دیں۔ یہ ایک راستہ ہے جو قرآن نے

نقصان اور خسران سے بچنے کا ہمیں سکھلایا ہے اور فرمایا ہے۔ والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین امنوا وعملوا الصّٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر زمانہ کو اپنے اِردگرد دیکھ لو (زمانہ کی کونسی چیز ہے جس کے لاحق حال نقصان نہیں۔ پھر جن راہوں سے اور چیزیں نقصان سے بچتی ہیں وہی راہ تمہارے لئے ہے) بیشک اِنسان خسران میں ہے مگر وہ انسان اس سے بچ جائیں گے) جو صحیح اصولوں کو تسلیم کر کے اس پر عمل کرتے ہیں۔ پھر ان اصُول حقہ سے دوسروں کو بھی اطلاع دیتے ہیں۔ اور صبر کے ساتھ اوروں کو چلاتے ہیں۔ اس سُورۂ شریف میں ایک بات خاص کر قابل غور ہے۔ کہ یہاں جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے یعنے کسی اِنسان کا نقصان سے بچنا جن صحیح اصُولوں کو چاہتا ہے۔ وہ اوروں کو بھی معلوم ہوں۔ اور ایک دوسرے کو افراد قوم ان کی تلقین کرے۔ شخصی تعزز بڑی چیز نہیں۔ بلکہ قوم کے بہت سے افراد ایسے ہونے چاہئیں۔ میں نے اس امر کا خصُوصاً اسلئے ذکر کیا کہ ہماری قوم میں اس امر کے متعلق سخت بُخل ہے +

دل تو چاہتا ہے کہ اور بھی قرآنی ہدایات کا جن سے

کیرکٹر اور قوم بنتی ہے ذکر کر دوں - لیکن میرے ولایت
واپس جانے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے - اور میں
چاہتا ہوں - کہ اس وقت کو سفر حضر جیسی بھی حالت ہو
امور پیش آمدہ کے متعلق چند اور کتابیں لکھنے میں
صرف کر دوں - علاوہ ازیں قوم میں بہتر سے بہتر علماء موجود
ہیں - شاید انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی - وہ للہ
اس طرف توجہ کریں - اور قوم کو بتلائیں کہ امور حاضرہ پر
قرآن کیا ہدایت فرماتا ہے - اسلئے چند سطور بقیہ پر ان
معروضات کو ختم کرتا ہوں +

ایک بات کی جو ہم میں من حیث القوم کمی ہے وہ
تعزیز باہمی ہے - اس وقت قوم کی بہتری یہ چاہتی ہے
کہ جہاں مذکورہ بالا بخل کو چھوڑ کر تو اصدا بالحق"
کریں - وہاں اپنے بھائیوں پر نکتہ چینی چھوڑ دیں
ہر ایک کے فعل کو خواہ وہ کیسا ہی ناقص ہو - اگر
نیک نیتی سے ہے تو نظرِ استحسان سے دیکھیں ایکدوسرے
کی قدر دانی کریں - نہ صرف دوسروں کی نکتہ چینی دوسروں
پر حرف رکھنا - اور انہیں بڑے الفاظ سے یاد کرنا ہی
چھوڑ دیں - بلکہ ایکدوسرے کا ذکر عزت سے کریں ایکدوسرے
کا حوصلہ بڑھائیں - فی الجملہ جو سلوک کسی اپنے عزیز کے

نقصوں کے متعلق ہم اس سے کرتے ہیں۔ یعنی ان پر چشم پوشی کر کے اسکی حوصلہ افزائی کے الفاظ بولتے ہیں۔ یہی طریق ہم ہر مسلمان سے مرعی رکھیں۔ اس موقعہ پر للہ آیات ذیل پر غور کرو۔ پھر دیکھو کہ قرآن نے تمہارا ہی نقشہ ان آیات میں کھینچا ہے یا کسی اور قوم کا؟

انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون ۰ یایھا الذین امنوا لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرا منھم ۰ ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان ومن لم یتب فاولئک ھم الظلمون ۰ یایھا الذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا ط ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ ط واتقوا اللہ ان اللہ تواب رحیم ۰ یایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ط ان اکرمکم عند اللہ اتقکم ط ان اللہ علیم خبیر ۰ قالت الاعراب امنا ط قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم ط ترجمہ مسلمان تو بس (آپسمیں بھائی) بھائی ہیں۔ تو اپنے دو بھائیوں میں میل جول کرا دیا کرو۔ اور

خدا (کے غضب) سے ڈرتے رہو۔ تاکہ (خدا کی طرف سے) تم پر رحم کیا جائے۔ مسلمان مرد مردوں پر نہ ہنسیں۔ عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (خدا کے نزدیک) اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں پر (ہنسیں) عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور آپس میں ایکدوسرے کو طعنے نہ دو۔ اور نہ ایک دوسرے کے نام دھرو۔ ایمان لائے پیچھے بدتہذیبی کا نام ہی بُرا ہے۔ اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئیں گے۔ تو وہی (خدا کے نزدیک) ظالم ہیں۔ مسلمانو (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو۔ کیونکہ بعض شک (داخل) گناہ ہیں۔ اور ایک دوسرے کی ٹٹول میں نہ رہا کرو۔ اور نہ تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے بُرا کہے۔ بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کریگا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ یہ تو (یقیناً) تمہیں گوارا نہیں (تو غیبت کیوں گوارا ہو کہ یہ بھی ایک قسم کا مُردار کھانا ہے) اور اللہ (کے غضب) سے ڈرتے رہو بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ لوگو ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوّا) سے پیدا کیا۔ اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھیرائیں۔ تاکہ ایکدوسرے کو شناخت کر سکو (ورنہ) اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف

وہی ہے۔ جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔ بیشک اللہ جاننے والا باخبر ہے۔ عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے (اے پیغمبر ان سے) کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں (یوں) کہو کہ ہم مسلمان ہوگئے۔ اور ایمان کا تو ہنوز تمہارے دلوں میں گزر تک نہیں +

اس مقدس اقتباس کے آخری الفاظ پر غور کرو ان جنگلیوں کو کہدو۔ تم نے اسلام تو قبول کرلیا۔ تم اپنے آپ کو مومن مت کہو مسلم کہو۔ کیونکہ تم نے صرف اسیقدر کیا ہے کہ ایک صداقت کو بطور صداقت مانا ہے۔ صداقت کو تم نے عملاً قبول نہیں کیا جو شانِ مومن ہے۔ قرآن کی اور ہدایات کو چھوڑ دو۔ صرف ان ہی آیات پر غور کرو۔ پھر اگر من حیث القوم ان پر ہمارا عمل نہیں تو قرآن نے تمہارا نام جنگلی رکھا۔ یہ جو تمدن کی راہیں تمہاری کتاب میں ہیں۔ ان کے تذکرہ کا آخر کیا مطلب ہے۔ اس کا صفحہ صفحہ اس دنیا میں تمہیں خلعت امتیاز پہنانے کے رستے بتلاتا ہے۔ جو کتاب تمہیں مختلف انداز پر اس دنیا میں مقتدر اور معزز بننا سکھلاتی ہے۔ جو تمہیں خلیفۃ الارض کا خطاب ہی نہیں دیتی۔ بلکہ تمہیں علم آدم الاسماء کلھا میں اس خلافت کے حاصل کرنے کا

طریق بھی بتا دیتی ہے۔ یعنے ان کے لئے اِن کھلے لفظوں میں تمہیں اشارہ کرتی ہے۔ ملکوت السمٰوات والارض تمہارے صاحب علم ہونے پر تمہارے غلام ہو جائیں گے۔ تم خواص الاشیاء کا علم حاصل کرو۔ کُل اشیاء کے ملکوت تمہاری من مانگی مراد پوری کرینگے ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا نے تمہیں یہ اعلان کر دیا ہے کہ تمہارے ارد گرد زر و مال پھیلا ہوا ہے جسے تم خذف ریزہ سمجھ کر پھینکدیتے ہو۔ وہ سونا چاندی سے بھی قیمتی ہے۔ اس قرآنی اشارہ پر مغرب نے عمل کیا۔ تمہاری چھوڑی ہوئی ہڈیاں تم سے کوڑیوں میں مول لیگئے۔ اور انہیں ہی جواہرات کے عوض میں تمہیں واپس کر دیا۔ اگر دین سے مُراد یہی نماز و روزہ تھا جسکی ادائیگی پر ہم اپنے آپ کو صاحب عمل سمجھتے ہیں۔ تو پھر قرآن نے ان باتوں کا کیوں ذکر کیا ہے؟ تم ہمیں الفقر فخری سناتے ہو (حالانکہ یہ قول معتبر و مستند نہیں) اور سورۂ جمعہ۔ ہمارے کاروبار میں ہماری تجارت اور ہمارے روزگار و اشغال کا نام فضل الٰہی رکھتی ہے۔ اب بتلاؤ کس پر عمل کریں۔ اس ضمن میں مجھے نہایت ادب اور کے ساتھ علمائے کرام کیخدمت میں عرض کرنا ہے۔ جو کچھ اب تک ان کی طرف سے ہوا ہے وہ بھی قابل شکر یہ ہے معمولات شرعیہ پر

یا فرقی تنازعات پر یا ان باتوں پر جن تک ناواقفیت نے دین کو محدود کر رکھا ہے۔ ان پر کافی سے زیادہ مصالحہ موجود ہے۔ اب اللہ دینی ابحاث کے میدان کو متقدمین کی طرح وہ وسیع کر دیں۔ امور مدنیہ منزلیہ اخلاق۔ سیرت۔ سیاسیات۔ تجارت۔ کسب معاش وغیرہ پر قرآن اور حدیث کی روشنی میں مواعظ حسنہ شروع کریں۔ وہ آنیوالی نسل کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سکھلائیں۔ محنت اور جفاکشی کی عادت ڈالنے کی تلقین فرمائیں۔ انہیں وہ طریق اور اُن طریقوں پر بطور فرض مذہبی چلنا سکھلائیں۔ کہ جن سے ہماری قوم کے افراد ہر پیشہ و فن میں صاحب کمال پیدا ہوں۔ زر کثیر کے مالک ہوں۔ خود آزاد اور معزز زندگی بسر کریں۔ اور ومما رزقنٰھم ینفقون پر عمل کرنا جانیں۔ اخلاق فاضلہ اُن کی شان ہو۔ اور رذیلہ خیال و حالات سے انہیں نفرت ہو۔ اکتساب خیرات کی ان میں تڑپ ہو۔ اور منہیات سے اُنہیں وحشت ہو۔ فی الجملہ انہیں ہر رنگ میں صاحب عمل بنائے مثلاً اگر آج سے دس بیس سال کو یہاں ہوم رول آجائے تو خدا کے لئے بتلاؤ۔ تمہارا اس حکومت میں کونسا

حصہ ہوگا - قوت شماری کی پرواہ نہ کرو لیکن مُہمات
حکومت کا سرانجام دینا چھوڑ انہیں سمجھنے کی بھی
استعداد کتنوں میں ہے؟ اس اسکیم جدید کی رو سے
جو ہر ایک صوبہ میں گورنر یا لفٹنٹ گورنر کے پہلو بہ پہلو
ایک ہندوستانی افسر ہوگا - اس عُہدہ کی قابلیت ہم
میں سے کتنوں میں ہے؟ میں مان لیتا ہوں - دس
پندرہ مسلمان نکل بھی آئیں گے - لیکن برادران
وطن کو دیکھو ہر صُوبہ میں اس ضرورت کی اہلیت والے
بیسیوں نہیں سینکڑوں موجود ہیں میں مختلف مجوّزہ
صورتوں کے ممدُوح یا مذمُوم ہونے میں کچھ نہیں
کہ سکتا - کیونکہ مجھے پالیٹکس کی سمجھ نہیں - لیکن یہ
دیکھنے کی آنکھیں رکھتا ہوں - کہ ان مجوزہ صورتوں
کے تقاضے ہم پورے نہیں کر سکتے - ہمارے پنجاب
میں ایک لالہ ہرکشن لال سینکڑوں گریجوئیٹوں کے
کفیل روزگار ہو چکے ہیں - ہم میں اس کی شان
کے کتنے ہیں؟ آج تعلیمیافتہ ہندؤں کا رُجحان عام
طور پر تجارت کی طرف ہے - ان کے پشت پناہ
صدہا ہندو صاحب سرمایہ ہیں - ایک نیک چلن ہندو
تعلیم پانے کے بعد خواہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو ہزاروں

روپیہ بطور سرمایہ اپنے بھائیوں سے لے سکتا ہے کیا اس وقت من حیث القوم ہماری بھی ایسی ہی ساکھ ہے۔ کیا ہمارے اعمال و اخلاق نے بغیر چھوڑ اپنوں میں ہمیں صاحب اعتبار کر رکھا ہے۔ ہندو بھائیوں سے تو توقع رکھنا ہی لاحاصل ہے۔ اور پھر غضب تو یہ ہے۔ کہ جب کسی شریف ہندو نے ہم پر اعتبار کیا۔ ہم نے اس کے ننگ و ناموس تک کی پرواہ نہ کی۔ پھر ہمیں کون سرمایہ دیگا۔ جو ہم تجارت کرینگے آج ہندوستان میں مختلف کلیں فیکٹریاں۔ کارخانے کھلنے شروع ہوئے ہیں۔ خدا کے لئے غور کرو۔ ان میں مسلمانوں کا کتنا حصّہ ہے۔ خوب سمجھ لو کہ موجودہ ہندو مسلمانوں کا میل ابھی مُدّت دراز چاہتا ہے۔ جب ان میں وہ باہمی اعتبار پیدا ہوگا۔ جو مسلمانوں میں آپس میں اور ہندوؤں میں آپس میں ہے۔ جو اسوقت ہرگز نہیں۔ ملاپ کے کچھ معنے ہونگے۔ ملازمت کے متعلق بھی اگر عدم تعاون ضروری ہی سمجھا جائے۔ تو پھر اسے اپنا نصب العین رکھو۔ لیکن اس کے عمل کا وہ وقت ہوگا۔ جب ملازمت سرکار چھوڑنے والوں کے لئے کم از کم سرمایہ اور روزگار ہندو بھائیوں کی طرح اپنی قوم

میں موجود ہوگا۔ خدارا قوم میں قوتِ عمل پیدا کرو۔ اور یہ حالت مطلوبہ جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں تھوڑے وقت میں ہمارے سامنے آجائیگی۔ یہی باتیں مسئلہ عدم تعاون متعلقہ تعلیم پر بھی مجھے قوم کو کہنی ہیں۔ اگر یہ امور تمہارے محاکموں میں تمہاری نجات کا موجب ہوسکتی ہیں۔ اور اس فیصلہ دینے کے اہل بھی شاید سیاسی لیڈر ہوں۔ تو پھر اپنی قوم میں اس حالت کے پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ جس کے سوا تمہاری عدم تعاون کی مہم رُوبراہ ہو۔ اس بات کو نہ بھولیں۔ کہ ہم میں جو قحط الرجال ہے۔ وہ ہماری ہلاکت کے لئے کافی ہے۔ اوّل ہر کام کے اہل آدمی پیدا کرو پیچھے قدم اُٹھاؤ۔ قحط الرجال کا تو ہر جگہ سوال ہے میدان سیاسیات میں تمہارے پاس کتنے ہیرو ہیں۔ کس قدر ہیرو ہیں۔ کس قدر تکلیف دہ اور روح فرسا واقعہ ہے۔ کہ آج تمہارے معاملات کا سلجھانے والا ایک غیر قوم اور غیر مذہب ہم سے ہے۔ جس قوم کی یہ حالت ہو اُسے نہایت احتیاط سے قدم اُٹھانا چاہیئے۔ ہجرت کا قدم جس قدر غلط تھا وہ ظاہر ہے۔ ہمارے مہاجرین میں اگر روح ہجرت ہوتی تو

یہاں ہی سب کچھ ہو جاتا۔ اور بالفرض اگر حالات مکان و زمان ہجرت کو تبدیلیٔ مکان کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ تو سچے مہاجرین کے لئے خدا تعالیٰ تو پہلے ہی انصار پیدا کر دیا کرتا ہے۔ یہ سب مصائب ہمیں جگانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ گذشتہ سو سال سے زمانہ نے کبھی گدگدی کی۔ کبھی ہم پر سے لحاف اُتارا۔ کبھی پانی کے چھینٹے دیئے۔ کبھی چارپائی سے دھکے دیئے۔ پر ہم نہ اُٹھے۔ جب ہمیں خواب غفلت سے جگانے کا کوئی طریق کارگر نہ ہوا۔ تو آج موت کو ہمارے سامنے کھڑا کر دیا۔ کہ جاگو اور میدان عمل میں قدم رکھو ورنہ ہمیشہ کیلئے تمہاری صف لپیٹ دی جائے گی۔ خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کو دنیا میں نہیں رہنے دیتا۔ جو بدعملی اور ذنوب کے باعث ہلاکت کے قریب ہو جاتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کو مٹانے میں ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اور نہ ایسا کرنے میں اُسے کسی کا خوف و خیال ہے۔ فدمدم علیھم ربھم بذنبھم فسوّٰھا ولا یخاف عقبٰھا۔ خدا تعالیٰ میری قوم کو اس حالت تک پہنچنے سے بچالے آمین ثم آمین

۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء بمقام سرابایا (جاوا) بنگلہ سیٹھ یوسف حاجی احمد صاحب

خواجہ کمال الدین

مغربی ممالک

میں

اشاعت اسلام کی امداد کی ایک آسان راہ

مینے انگریزی اور اردو زبان میں تصنیف کتب کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جسمیں ذیل کی کتابیں کچھ طبع ہو چکی ہیں۔ اور کچھ پریس میں ہیں یہ کتابیں واقعات و مصائب حاضرہ متعلقہ اسلام کو سامنے رکھ کر ایک دردمند دل کی قلم سے نکلی ہیں۔ ان کے پڑھنے سے انشاء اللہ العزیز قوم کو یقیناً فائدہ ہوگا۔ ان کتابوں کا کُل کا کُل منافع اشاعت اسلام کی امداد میں جا دیگا۔ میری طرف سے مسلم مشن ووکنگ کی یہ امداد ہے۔ مسلمان بھائی ان کتابوں کو خرید کر عند اللہ ماجور ہوں۔ ان کتب کی قیمت کے مقابلہ میں خود ان کتب کے مضامین بہت ارزاں ہیں لیکن اس پر بھی ہمارے احباب کا روپیہ جو ان کتابوں کی خرید میں خرچ ہوگا۔ وہ بھی خدا کی راہ میں ہی خرچ ہوگا۔ وہ ضرور بالضرور عند اللہ ماجور ہوگا +

خادم

خواجہ کمال الدین مسلم مشنری